آتشِ گل

جگر مراد آبادی

انتساب

مَیں اپنے اس مجموعۂ کلام کو قائدِ ملّت مولوی بہادر خاں مرحوم سابق نواب بہادر یار جنگ کے

نام نامی سے منسوب کرنا اپنا اخلاقی و ادبی فرض تصوّر کرتا ہوں، جو سراپا گداز، مجسّم اخلاص،

فقید المثال مقرّر، کام یاب مصلح، اپنے وقت کے عظیم المرتبت خطیب اور ایک جری انسان تھے

جن کے گفتار و کردار میں کوئی تضاد نہ تھا۔

وہ بیک وقت تمام محاسنِ شعری کا احاطہ کر لیتے تھے اور اچھے شعر سے اتنی شدت کے

ساتھ متاثر ہوتے تھے کہ میں نے اپنی پوری زندگی میں ایسا کوئی دوسرا خوش مذاق نہیں دیکھا۔

خدائے رحمان و رحیم ان کی روح کو اپنا قربِ خاص عطا فرمائے

جگر مرادآبادی

فہرست

(پروفیسر رشید احمد صدیقی)

غزل جتنی بدنام ہے - اتنی ہی مجھے عزیز ہے - شاعری کا نام آتے ہی میرا ذہن غزل کی طرف مائل ہوتا ہے - غزل کو میں فن نہیں، اپنی شاعری کی آبرو سمجھتا ہوں - ہماری تہذیب غزل ہیں اور غزل ہماری تہذیب میں ڈھلی ہے - دونوں کو سمت و رفتار ایک دوسرے سے حاصل ہوئی ہے - اس پر نہ ہنسنا چاہیئے نہ رونا - اس کا احترام کرنا چاہیئے -

ہندوستان ہیں جن دیسی بدیسی زبانوں، مولویوں یا روایات کی بڑی مان وان ہے، یا رہی ہے - اردو ان کی غزل ہے - غزل، شاعری نہیں، تہذیب بھی ہے - وہ تہذیب جو دوسری تہذیبوں کی نفی نہیں کرتی بلکہ ان کی تصدیق بھی کرتی ہے - اور تنقیح بھی، کبھی کبھی

تزکیہ بھی ۔ غزل کے اصطلاحی اور ابتدائی مفہوم پر اب زور دینے کی ضرورت نہیں ہے ۔ فن ہو، روایت ہو، مذہب و اخلاق ہو ۔ اُن کا رشتہ اپنے ماسبق سے ضرور ہوتا ہے ۔ لیکن اُن کا احترام کسی اور بنا پر کیا جاتا ہے ۔ غزل کی اہمیت کا انحصار اس پر بالکل نہیں ہے کہ اُس میں یا اُس کے وسیلہ سے عورتوں سے گفتگو کی گئی یا کی جاتی ہے ۔ اس کا احترام اس لئے کیا جاتا ہے کہ اس سے گفتگو کرنی آجاتی ہے ۔ اُردو ادب میں ہر طرح کے شاعر گذرے ہیں ۔ اُن کی شاعری کا مقصد و محور بھی جُداگانہ رہا ہے ۔ لیکن ہماری شاعری میں اثر کا جادو غزل ہی نہیں تو غزل ہی سے جگایا گیا ہے ۔

غزل میں ہمارے ہاں بے راہروی بھی ملتی ہے ۔ ہر طرح کی بے راہروی اور جی بھر کے بے راہروی، یہ غزل کا قصور نہیں ہے ۔ یہ اُس راہرو کا قصور ہے جو اپنی کم نگہی یا کم ظرفی سے رہگذر کے فریب کو منزلِ مقصود سمجھ لیتا ہے ۔ ادنےٰ درجہ کے لوگوں نے زندگی کی بڑی قدروں کی اسی طرح بے حرمتی کی ہے ۔ غزل کو بُرا بتانا یا اُسے ادنےٰ درجہ کی شاعری قرار دینا پڑھے لکھے سمجھدار لوگوں کے نزدیک اب ہنسی کی بات سمجھی جاتی ہے ۔

صنفِ شاعری کے اعتبار سے میں غزل کو سب سے اونچا درجہ نہیں دیتا اور نہ اچھے سے اچھے غزل گو کو سب سے بڑا شاعر ماننا ضروری سمجھتا ہوں ۔ غزل ساری شاعری بھی نہیں، شاعر کا درجہ اصنافِ سخن سے متعیّن بھی نہیں ہوتا ۔ شاعری میں کسی مخصوص زندگی، ذہن اور زمانہ

کی عکّاسی، ترجمانی یا تلاش و طلب بھی خواہ مخواہ سی بات ہے۔ شاعری دنیا کی مادری زبان ہے۔ بڑی شاعری وہ ہے، جہاں انسان اپنی منزلت محسوس کرے، نہ کہ رنج و راحت، عذاب و ثواب یا روس و جاپان۔

د میں شاعری میں تجربات کا قائل ہوں، تجربات میں شاعری کا نہیں۔ تجربہ کو تجربہ ہی سمجھتا ہوں۔ الہام نہیں۔ میں ایسے تجربہ کو لاطائل اور خطرناک سمجھتا ہوں، جہاں نتائج کے پرکھنے کی نہ ہمّت ہو نہ توفیق، نہ نیت۔ تجربہ کرنا جتنا آسان ہے، اس سے کہیں زیادہ مشکل اس تجربہ سے صحیح نتیجہ اخذ کرنا ہوتا ہے۔ اپنی کوشش پر فخر کرنا جتنا آسان ہے اتنا ہی اپنی حماقت کو تسلیم کرنا دشوار۔ انسانی تاریخ میں جگہ جگہ اس کی مثالیں ملیں گی۔ فن اور زندگی دونوں میں جان تجربہ ہی سے آتی ہے۔ جو تجربہ سے بھاگے یا تجربہ میں پھنس کر رہ گئے۔ ان کا مستقبل کوئی نہیں۔ بذاتِ خود میں مستقبل کا کچھ زیادہ قائل نہیں ہوں میں تو ماضی کے مستقبل اور مستقبل کے ماضی کا زیادہ قائل ہوں۔ مستقبل کا میں یوں بھی عاشق نہیں ہوں کہ میں نے اس کا منتظر بالعموم ایسے ہی لوگوں کو پایا۔ جو اپنے مستقبل کے لئے زیادہ فکرمند ہوتے ہیں بہ نسبت کسی دوسرے کے۔)

میں شاعری میں اس لئے تجربہ کا قائل نہیں ہوں کہ غزل یا ہم آپ واجب القتل ہیں۔ بلکہ اس لئے کہ جو لوگ غزل سے دلچسپی نہیں رکھتے یا اس کو کافی نہیں سمجھتے اُن کے لئے

شاعری کے دروازے بند نہ ہو جائیں۔ شاعری اصنافِ سخن میں نہ کبھی قید ہوئی، نہ ہو سکتی ہے۔ زندگی کے بدل جانے سے شاعری کی وضع قطع، موضوع، اسلوب و انداز کا بدل جانا بھی کوئی قیامت نہیں۔ ایسا ہوتا رہا ہے۔ ہونا چاہئیے اور ہو کر رہے گا۔ وضع قطع اور موضوع بھی شاعری نہیں ہے۔ شاعری کو وضع قطع میں محدود کر دینا رسم ہے۔ اور موضوع میں مقید کرنا پروپیگنڈا، مجھے دونوں میں سے کسی ایک پر بھی فخر نہیں۔)

سائنس اور نفسیات نے ہمارے ذہن و فکر کو نئی داویوں اور نئے زاویوں سے آشنا کیا ہے۔ ان کا کام بھی یہی ہے۔ نئی حقیقتیں برابر سامنے آ رہی ہیں۔ جنہوں نے جانی پہچانی حقیقتوں کو کہیں زیادہ اجاگر کر دیا ہے۔ کہیں ان کو پیچھے دھکیل دیا ہے۔ اور کہیں بالکل ختم کر دیا ہے۔ ادب، شاعری، مصوری، زندگی، غرض ہر جگہ یہ اثرات نمایاں ہیں۔ مصوری اور شاعری کا نیا انداز دیکھ کر ہم طرح طرح سے بدکتے ہیں، یہ بدکنا صحیح نہیں ہے۔ ہم نے حسن کو اپنی پسند یا ناپسند کی باندی بنا لیا ہے۔ لیکن نہ حسن مقید محدود ہے۔ نہ انسان کی پسند و ناپسند۔ اس لئے پسند و ناپسند کے معاملہ میں احتیاط و انصاف کو ہاتھ سے نہ دینا چاہئیے۔ کائنات کا حقیر ترین جزو بھی اتنا ہی حسین، عظیم، ناقابل فہم یا ناقابلِ تسخیر ہے۔ جتنا کہ یہ پورا کارخانۂ قدرت، اس لئے جزو کل کا تصور اعتباری ہے۔

حقیقی نہیں۔ کائنات حسن بھی ہے اور قانون بھی۔ اس حسن اور قانون کو سمجھنے کی کوشش کرنا چاہیئے ہم ایسا نہیں کرتے۔ ہم تو اپنی پسند کی عورت کو حسن اور اپنی پسند کی لغت کو قانون سمجھتے ہیں۔

حقیقی اور بڑی شاعری شاعر کا انفرادی، یگانہ اور لازوال کارنامہ ہوتا ہے۔ برخلاف سائنس کے کارناموں کے جو مشترکہ محنت اور تحقیقات کا نتیجہ ہوتے ہیں۔ ایٹم بم بنانے میں معلوم نہیں کتنے سائنس داں اور سائنس کے کارپرداز شریک رہے ہوں گے۔ لیکن اقبال کی نظم "تنہائی" "مسجد قرطبہ" یا "ساقی نامہ" صرف اقبال کے کارنامے ہیں میرا مقصد یہاں سائنس کی اہمیت و عظمت سے انکار نہیں ہے۔ صرف شاعر کا منصب جتانا ہے۔

تیس سال کے اندر دو ایسی بھیانک جنگوں کا وقوع میں آنا۔ جن کی مثال تاریخ میں نہ ملتی ہو۔ زندگی کے طور طریقوں کو مسخ یا منقلب کر دینے کے لئے کافی ہے۔ جب زندگی اس طرح زیر و زبر ہو چکی ہو۔ تو شعر و ادب کے زیر و زبر ہو جانے میں کیا شبہ ہو سکتا ہے۔ اب یہ ہمارے عالی دماغ اور بڑے لکھنے والوں کا فرض ہے کہ وہ بتائیں۔ کہ ہم کس مصیبت یا فریب میں مبتلا ہیں۔ کہیں ایسا تو نہیں ہے کہ ہم گرفتار تو ان جنگوں کے عواقب کے ہوں۔ لیکن سمجھتے یا سمجھاتے ہوں کہ خود زندگی تعبیر ہے ان عواقب سے۔

مصیبت کو دُور کرنا جتنا مشکل ہوتا ہے، اس سے کہیں زیادہ سہل، منفعت بخش اور ذلیل مشغلہ اس مصیبت سے ناجائز فائدہ اُٹھانا ہوتا ہے۔ غلّہ پیدا کرنے سے زیادہ منفعت بخش مشغلہ غلّہ کی سیہ بازاری ہے۔ کسی قوم یا شعر و ادب کا مطالعہ اس نقطۂ نظر سے کیا جائے۔ تو معلوم ہو جائے گا کہ وہ قوم، یا اس کا شعر و ادب منزلت یا مذلت کے کس درجہ پر ہے۔ ہم میں ایسے لوگوں کی کمی نہیں جو یہ سمجھتے ہیں کہ ادب اور زندگی کی حرمت سے کیا حاصِل، جب ان دونوں کے بیچ کھانے میں نفع ہی نفع ہو۔ صنعتی تہذیب یا معاشی بحران میں ایسا ہونا تعجب کی بات نہیں۔ تعجب اس کا ہے کہ صنعتی تہذیب اور معاشی بحران کو انسانیت کا تقاضا یا مقصد یا تہذیب کا محور و منتہا قرار دے دیا جائے۔

دُنیا کتنی ہی تیزی سے آگے کیوں نہ بڑھ رہی ہو، انسان کا ذہن ہمیشہ سے اس سے آگے ہوتا ہے۔

انسانی ذہن اپنے کارنامے پیچھے چھوڑتا ہوا آگے بڑھتا ہے۔ وہ ان کارناموں میں نہ کبھی پناہ لیتا ہے نہ ان کو پناہ دینے کی خواہ مخواہ کوشش کرتا ہے۔ اچھے اور

اسدؔ ہم وہ جنوں جولاں گدائے بے سر و پا ہیں — کہ ہے سر پنجۂ مژگانِ آہو پشت خار اپنا

اس شعر کو آپ غالبؔ کا کارنامہ سمجھیں یا نہ سمجھیں، یہاں اس کا یاد آ جانا میرا کارنامہ ضرور ہے۔ ۱۲

بڑے کارنامے اپنی حفاظت خود کرتے ہیں ۔ فطرت (نیچر) افراد کا بالکل نہیں لیکن نوع کا ضرور احترام کرتی ہے ۔ اس کے برخلاف آرٹ اور ادب نوع (اصناف) کا احترام بالکل نہیں کرتے ۔ افراد (آرٹسٹ اور ادیب) کا کرتے ہیں ۔ کرنے پر مجبور ہیں ۔ فن ہو یا زندگی، افراد ہی کے مرکب پر سوار ہو کر آگے بڑھتی ہے ۔ ان کے لئے کوئی اور مرکب اب تک دریافت نہیں ہو سکا ہے ۔ قدیم ہو یا جدید، اپنے اظہار یا اقتدار کے لئے فرد کا محتاج ہے ۔ کسی اور کا نہیں ۔ فرد کی اہمیت سے انکار کرنا جہالت بھی ہے، ظلم بھی ۔

جگر صاحب کو میں نے ہر حال میں دیکھا اور پایا ہے، جب وہ آپے میں نہ رہتے جب بھی اور ہوش و حواس میں ہوتے جب بھی میں نے ان کو اصغر صاحب مرحوم کے یہاں مؤدب و زانو بیٹھے دیکھا ہے ۔ اور ایسی مجلس میں بھی جہاں تبختر و تمکنت یا ثروت و اقتدار کی کارفرمائی ہوتی ۔ شاگردوں اور عقیدت مندوں کے حلقے میں بھی پایا ۔ اور ان لوگوں کی صحبت میں بھی دیکھا ۔ جو خود جگر صاحب کی شاعری اور شخصیت پر بڑی بیباکی اور آزادی سے اظہارِ خیال کرتے ۔ وہ ہمیشہ جگر صاحب ہی ملے ۔ سب سے زیادہ نڈر اور بیباک میں نے ان کو بد دماغ روساء اور اُمراء کی صحبتوں میں پایا ۔ دوسری طرف کم لوگ ایسے دیکھے ۔ جو خوردوں کی دلنوازی اور دوستوں و بزرگوں کی تکریم

ہیں جگر صاحب سے آگے ہوں۔

مجھے وہ زمانہ خوب یاد ہے جب جگر صاحب پر شراب کا بدترین تسلّط تھا۔ اکثر وبیشتر وہ آپے ہیں نہ ہوتے۔ عزیز اور عقیدت مند اُن کو قدم قدم پر سنبھالتے ہوتے اس حال میں بھی اُن کی زبان سے کبھی ایسا فقرہ نہ نکلتا یا کوئی ایسا فعل سرزد نہ ہوتا۔ جس سے خود اُن کو یا اُن کے دوستوں کا شرمندگی اٹھانا پڑتی۔ شراب اور شاعری سے زیادہ بے نقاب کرنے والی کم کوئی چیز ہوگی۔ جگر صاحب کو ان دونوں نے جی کھول کر بے نقاب کیا۔ برہنگی کہیں نظر نہ آئی۔ رکھ رکھاؤ ہر جگہ موجود، غالبؔ نے کسی ایسے ہی موقع پر کہا ہوگا ؎

پیمانہ براں رند حرامست کہ غالبؔ
در بے خودی اندازۂ گفتار نداند

جگر صاحب کو میں نے شاعری پر بحث کرتے بھی سُنا ہے۔ وہ شاعری پر بحث نہیں کر سکتے۔ اپنی پسند یا ناپسند کے اشعار پر وجد کر لیتے یا جھگڑ لیتے ہیں۔ وہ اقبال کی شاعری کے کچھ بہت زیادہ قائل نہیں ہیں۔ فانی بھی نہ تھے۔ جگر اور فانی دونوں کا شاعری کا نقطۂ نظر شخصی شاعرانہ ہے۔ غزل گوئی میں ہوتا بھی کچھ ایسا ہی ہے۔ شاعری شخصی بھی ہوتی ہے آفاقی بھی۔ میں دونوں کا قائل ہوں۔ لیکن سر اُسی کے آگے جھکاتا ہوں جس کے

یہاں دونوں میں تمیز کرنا دشوار ہو جائے۔ جگر صاحب اقبال کے قائل ہوں یا نہیں، لیکن جہاں وہ جہت سے گذر کر جہان میں داخل ہوتے ہیں۔ وہاں اقبال سے اُن کو مفر نہیں ہوتا۔ اقبال سے کس اُردو شاعر کو اب مفر ہے۔

جگر کی شاعری نے بعض تنقید نگاروں کو بڑی دلچسپ مصیبت میں مبتلا کر دیا ہے۔ وہ کبھی غزل کی مذمت کر کے جگر کی مذمت کرتے ہیں۔ اور کبھی کسی شاعر کی مذمت کر کے جگر کی تعریف! مثلاً فلاں شاعر فلاں شاعر جیسا ہے یا نہیں۔ اِس لئے وہ اچھا یا بُرا ہے۔ مثلاً یہ اندازِ گفتگو!

جگر داغ کے قبیلہ کے ہیں۔ فانی اور اصغر یا غالب سے کوئی نسبت نہیں رکھتے....

.... جگر سے وہ ذہنیت شروع ہو جاتی ہے جو نئے دور کی اصل روح ہے۔

.... جگر کے لہجے میں خود باختگی اور تڑپ ہوتی ہے اس کا داغ اور داغ کے مدرسۂ شاعری میں کہیں پتہ نہیں اور نہ ہو سکتا تھا........ جگر کی شاعری میں جو روحانی دردمندی ہے وہ کچھ ہمارے ہی دور کی چیز ہے........ جگر کی شاعری بہت سطحی شاعری ہے۔ نامرادی اور بیچارگی کے احساس نے ان کے یہاں کچھ بے عنوان سی نرمیاں ضرور پیدا کر دی ہیں۔ لیکن ادنےٰ درجہ کا بوس و کنار اور سستے قسم کی لذتوں

کی ہوس دوسرے شاعروں کی طرح ان کے یہاں بھی ملتی ہے .... البتہ جگر کے کلام میں ایک تلملاہٹ بھی پائی جاتی ہے جو ان لذتوں کے میسّر نہ ہونے کی وجہ سے پیدا ہوگئی ہے۔ جس کو انہوں نے اپنے لئے لذت بنالیا ہے .... جگر کی شاعری میں نفسیاتی مزاحم اور جذباتی رکاوٹوں کا کہیں پتہ نہیں ہے ...... جگر عشقیہ زندگی کے عارضی لمحات کے شاعر ہیں۔ شاعری کی نوجوان نسل نے جگر سے وہ بیباک معصومیت اور باغیانہ اور سرفروشانہ صداقت ازسرِنو پائی۔ جس کی کسی زمانے میں سعدی کا سا معلّمِ اخلاق قسم کھاچکا ہے اور جو نوجوانوں سے جاچکی ہے .... داغ سے جو ترکہ جگر نے پایا ہے وہ عشق کی آزمودہ کاری ہے .... جگر کے اشعار میں کسی قسم کی گہرائیاں نہیں ہوتیں۔ ان کے یہاں ایک تھما ہوا ایک جذباتی ہیجان ضرور ہوتا ہے۔ جس کو ہم اکثر کیف سمجھ لیتے ہیں .... جگر کو حکمت و اخلاق سے دُور کا بھی لگاؤ نہیں ہے۔ کائنات اور انسانی زندگی کے اسرار و رموز سوچنے سمجھنے کی ان کے اندر تاب ہے۔ نہ ان کو اس کی فکر کہ وہ زندگی کی ان گہرائیوں اور بلندیوں کا جائزہ لیں .... جگر کی رسائیِ فکر واحساس کا دائرہ بہت تنگ ہے۔ اور ان کے یہاں موضوع کے اعتبار سے زیادہ تنوع بھی نہیں۔ اس لحاظ سے وہ اپنے معاصرین مثلاً عزیز۔ فانی اصغر وغیرہ کے مرتبہ کو نہیں پہونچتے .... جگر کے اشعار میں جو نیاپن ہے اس

کا تعلّق دراصل انداز و اسلوب سے زیادہ ہے۔ فکر و احساس سے کم ہے وغیرہ

یہ باتیں اور اس طرح کی باتیں جگر کے کلام پر صادق آتی ہوں یا نہیں۔ نقّاد کے ذہنی اضطراب و انتشار کی غمازی ضرور کرتی ہیں۔ جگر ہی کی شاعری پر نہیں۔ اُردو شاعری پر بھی ہمارے اکثر نقّاد اظہار خیال کرتے ہیں۔ تو بالعموم ان کے سامنے یا تو اقبال کی شاعری ہوتی ہے یا ترقی پسند نظریے، اقبال کی شاعری اور ترقی پسند نظریے دونوں اپنی اپنی جگہ مسلّم، لیکن یہ کیا ضرور ہے کہ ہر شاعر انہیں دو حلقوں میں اسیر ہو۔ بالخصوص غزل گو! لیکن اس سے اتنا ضرور ظاہر ہوتا ہے کہ ہمارے ذہنوں پر اقبال کی کیسی گرفت ہے یا ہماری نیتوں پر ترقی پسندی کے نظریے کس درجہ مسلّط ہیں، یہاں میں فن تنقید پر کوئی بحث نہیں چھیڑنا چاہتا لیکن اتنا ضرور کہنا چاہتا ہوں کہ ہمارے بعض ہونہار اور ذی استعداد نوجوان جن میں تنقید کی اعلیٰ صلاحیتیں پوشیدہ ہیں غالباً دانستہ طور پر ہمارے بعض اچھے شعرا کے ساتھ انصاف نہیں کرتے۔ سیاسی استیلا نے شرفائے ادب کے ساتھ کبھی اچھا سلوک نہیں کیا ہے۔ آرٹ اور ادب کے خدمت گذاروں کو سیاسی نظریوں سے اتنا سرشار نہ ہونا چاہیئے۔ کہ وہ ادب کے صحیح خد و خال اور صالح تقاضوں کو فراموش کر

جائیں یا ان کو مسخ کرنے کی کوشش کریں۔

شاعر۔ ادیب۔ آرٹسٹ نہ زمانے کے پابند ہوتے ہیں نہ زندگی کے۔ نہ نقاد کے۔ زمانۂ زندگی اور نقّاد تینوں شاعر۔ ادیب اور آرٹسٹ کے منتظر ہوتے ہیں۔ زمانہ ان کا پابند ہوتا ہے وہ زمانے کے پابند نہیں ہوتے۔ وہ اپنے ارادوں کے غلام نہیں ہوتے بلکہ ارادوں کو اپنی ضرورت تسلیم کرواتے ہیں۔ اگر شاعر اپنے ماحول کا پابند یا نقاد کی حکم برداری پر مجبور رہو تو شاعری، ادب اور زندگی سے تازہ کاری جو عین زندگی ہے جاتی رہے۔ زندگی کا انسانی تصوّر شرف و منزلت کی زندگی کا تصوّر ہے، مرض و ماحول کا نہیں۔ مَیں یہ نہیں کہتا کہ جب ہر چہار طرف آگ لگ رہی ہو تو شاعر بانسری بجاتے رہنے میں حق بجانب ہے لیکن اسی کے ساتھ ساتھ یہ کہنے سے بھی باز نہیں رہ سکتا۔ کہ اگر بعض مواقع پر بانسری بجانا شاعر کو زیب نہیں دیتا تو ہر موقع پر نقّاد کا بھی بانسری بجانا کوئی قابلِ تعریف بات نہیں ہے۔

جس طرح مُلّاؤں نے خدا کے آداب و اخلاق، وضع و قطع، پسند ناپسند اور علم و عمل کی مکمّل ترجمانی اپنے ذمہ لے لی ہے اور ہمہ وقت یہ بتانے پر آمادۂ فساد رہتے ہیں کہ خدا نے یہ کیا ہے

یہ کرنا چاہتا ہے اور یہ کرے گا۔ اسی طرح بعض نقّاد مارنے مرنے پر تیار رہتے ہیں کہ زندگی یہ ہے۔ ادب وہ ہے۔ آپ رجعت پسند ہیں۔ میں ترقی پسند۔ اگر خدا اتنا ہی ہے اور ویسا ہی ہے جیسا کہ ملّا بتاتے ہیں اور زندگی اور ادب وہی ہے اور اتنا ہی ہے جتنا کہ ترقی پسند بتاتے ہیں تو ان کو ملّاؤں سے ناتا جوڑ لینا چاہئے۔

تنقید نہ یزداں کا فن ہے نہ اہرمن کا۔ وہ انسان کا فن ہے اور انسان کے بہترین کارناموں کے پرکھنے کا فن۔ ظاہر ہے بہترین کارناموں کے پرکھنے کے لئے انتہائی دیانت و دانشمندی اور احترام سے کام لینا پڑیگا۔ ترقی پسندی کے ساتھ انصاف پسندی بھی ہونی چاہئے تنقید نگار نہ تو پولیس کی مانند روزنامچہ تصنیف کرتا ہے نہ شانہ نشین فرشتوں کی مانند اعمالنامے مرتّب کرتا ہے۔ یہ کیسی تنقید ہے کہ امّت زید کی ہو، پیغمبر عمرو کا، خدا اکبر کا اور جنّت و دوزخ خالد کی! ہر امّت کا حشر اسی کے پیغمبر کے ساتھ اور اسی کے خدا کے سامنے ہوتا آیا ہے۔ یہ کہاں کی تنقید ہے کہ اکبر الہ آبادی ناکام رہے اس لئے کہ سر سیّد کامیاب رہے اور سر سیّد ناکامیاب رہے۔ اس لئے کہ کانگریس کامیاب رہی اور کانگریس اس لئے ناکامیاب رہی کہ چین پر روس کا قبضہ

ہوگیا اور وہ سں ناکامیاب رہیگا۔ اس لئے کہ رشید صدیقی جگر صاحب پر کچھ فرمارہے ہیں میں اپنے اکثر نقادوں سے کہونگا۔ "دل نہ ہنی بخوب ما طعنہ مزن بزشتِ ما"

غزل پر حکم لگانے سے پہلے ہمارے تنقید نگاروں کو یہ نکتہ بھی فراموش نہ کرنا چاہئے کہ غزل ایک طرف نومشقوں کے لئے مشق کی حیثیت رکھتی ہے تو دوسری طرف استادوں کی استادی کا معیار بھی متعیّن کرتی ہے۔ شاعری، بالخصوص غزل میں خالص احساس وفکر، اور خالص انداز و اسلوب کا میں قائل نہیں۔ ایک کو میں مرض سمجھتا ہوں دوسرے کو ہیپڑا یا بازی گری۔ ہم اور ہمارے شعراء اس طرح کی باتوں میں مدتوں مبتلا رہ چکے ہیں۔ بایں ہمہ میں انداز و اسلوب کو بہت عزیز رکھتا ہوں۔ کلیتہً نئی بات شاذ و نادر ہی کہی جاتی ہے۔ بات پرانی ہی ہوتی ہے اسلوب بیان اس کو نیا کر دیتا ہے۔ کوئی بات دلنشیں اور دیرپا نہیں ہوسکتی۔ اگر وہ صحیح اسلوب سے مناسب اسپرٹ میں نہ کہی جائے۔ اسلوب موزوں نہ ہو تو گفتنی ناگفتنی بن جاتی ہے اور موزوں ہو تو ناگفتنی، گفتنی۔ آج تک شعر و ادب میں جو افراتفری ملتی ہے اس کا بڑا سبب یہ ہے کہ لکھنے والے مناسب اسلوب اور اسپرٹ کو کام میں نہیں لاتے۔ مثلاً جسے ہم عریانی، فحاشی یا بدمذاقی کہتے ہیں وہ دراصل مناسب اسلوب اور اسپرٹ کا فقدان ہے۔ بات کرنی آتی ہو تو بات کبھی نہیں بگڑتی

/ ایک ہی بات ہزاروں آدمی ہزاروں سال سے کہتے آتے ہیں، اور کوئی خاص اثر نہیں ہوتا۔ لیکن اسی بات کو شاعر اس طرح کہہ دیتا ہے کہ وہ زبان زد ہو جاتی ہے اور کہاوت بن جاتی ہے۔ سب سے بہتر اسالیب ضرب الامثال میں ملتے ہیں۔ سہل ممتنع کا یہی مفہوم ہے۔ گالیاں، کوسنے، دعائیں۔ کہاوتیں بہت بڑے شعراء کے شاہکار ہیں۔

خارجی حالات و حوادث سے موجودہ غزل گویوں میں جگر سے زیادہ براہِ راست متاثر ہونیوالا شاید ہی کوئی اور ہو۔ جگر میں یہ بات آج سے نہیں مدتوں سے ہے۔ انہوں نے ہر بڑے حادثہ کا اظہار اپنے کلام میں اکثر کیا ہے۔ کچھ دنوں سے اُن کے کلام میں تاثرات کی یہ زیریں لہر زیادہ نمایاں ہو گئی ہے۔ غزل میں یہ چیز شروع تو حسرت سے ہوئی تھی لیکن جگر کے یہاں یہ زیادہ گہری اور بنیادی ہے۔ حسرت کے یہاں اس کی حیثیت خبر کی سی ہے۔ جگر کے یہاں یہ قلب کی دھڑکن بن کر نمایاں ہوتی ہے۔ میرے نزدیک یہی وہ مقام ہے جہاں شاعری شخصیت کو یا شخصیت شاعری کو پست یا بلند کرتی ہے شاعری اور پروپیگنڈے کا فرق بھی یہیں ظاہر ہو جاتا ہے۔

حسرت اور جگر دونوں اصلاً حسن و عشق کے شاعر ہیں لیکن ان دونوں میں یہ فرق ہے کہ ایک

محبوب کی موجودگی ہیں اور دوسرا محبوب کی دُوری پر غزل خواں ہوتا ہے۔ محبوب کی موجودگی وصال کی محرک ہوتی ہے، دُوری محبت کی۔ جگر محبت کے شاعر ہیں، حسرت محبوب کے۔ جگر دُوری و مہجوری کی عظمت کے قائل ہیں، کم سواد شاعروں کے خلاف وہ ہر قیمت پر وصل کے خریدار نہیں ہوتے۔ جگر متاع اور قیمت کے نازک اور گراں بہا رشتہ کو خوب سمجھتے ہیں اور اُسے نباہتے ہیں۔ ان کے عشق میں خواہ مخواہ کی فدویت یا فگندگی نہیں ہے۔ غالب نے سب سے پہلے نہایت واضح طور پر عاشقی کی سطح کو اونچا کیا۔ تہذیب رسمِ عاشقی حسرت کے یہاں غالب ہی سے آئی جسے جگر نے تادیبِ رسمِ عاشقی تک پہونچا دیا۔ اب تک تو یہ روایت چلی آتی تھی کہ شعراء عاشق کے جذبات و احساسات کی ترجمانی کرنے پر پورا زور صرف کر دیا کرتے تھے۔ جگر کے یہاں محبوب کے جذبات و احساسات کی بھی ترجمانی ملتی ہے!

شاعر (عاشق) وصالِ محبوب کی خواہش کا اظہار کریگا تو اس کا بہت زیادہ امکان ہے کہ وہ تہذیب سے گر جائے لیکن جب بھی وہ محبوب کے جذبات کی ترجمانی کریگا، احتیاط و احترام کے دائرہ سے قدم باہر نہ نکال سکیگا۔ اگر اس نے ایسا کیا تو خود اپنی نظر سے گر جائیگا۔ جگر عشق کے غلبہ میں محبوب کی عفّت کو کبھی نہیں فراموش کرتے۔ اردو کے عام شعراء کے یہاں محبوب کا کردار کچھ زیادہ بلند یا دل پسند نہیں ہے

ہندی شاعری کی روایت یہ ہے کہ اظہارِ عشق عورت (بیوی) کی طرف سے ہوتا ہے اور اکثر دردِ مہجوری کا اظہار ہوتا ہے۔ طلبِ وصال کا نہیں۔ یہی سبب ہے کہ اس طرح کی شاعری کا دائرہ کتنا ہی مختصر کیوں نہ ہو اس کی پاکدامنی مسلم ہے۔ اُردو شاعری میں عورتوں کی طرف سے مردوں نے ریختی میں جن باتوں کا اظہار کیا ہے۔ وہ اتنی شاعری نہیں ہے جتنی کہ ذہنی اوباشی۔ ریختی کے جواز میں بھی کچھ نہ کچھ کہا جا سکتا ہے لیکن وہ جس بات کی غمازی کرتی ہے وہ اپنی جگہ پر قائم رہتی ہے۔ ہمارے عام شعراء کے محبوب سے دوستی کرنے کی خواہش ہم میں آپ ہی مشکل سے پیدا ہوگی۔ جگر کے محبوب کو ہر شخص اپنانا چاہیگا۔ اُردو شاعری کو یہ زاویہ جگر نے دیا۔

جگر کو اصغر سے بڑی گہری عقیدت ہے لیکن شاعری میں وہ اصغر سے بالکل علیحدہ ہیں۔ اصغر سے ان کا شغف شخصی ہے شاعرانہ نہیں جس طرح حالی کا غالب سے تھا۔ اصغر کے یہاں تخئیل زیادہ جذبہ کم ہے۔ جگر کے یہاں جذبہ کی شدّت ہے اسی لئے تخئیل کی کمی۔ اصغر کی شاعری حسن کی شاعری ہے۔ جگر کی عشق کی، حسرت کی محبوب کی۔ اصغر کے یہاں تصوّف کا عمل دخل بنیادی نہیں ہے اونچے درجے کی ریاضیات و طبیعیات کے مانند اونچے درجے کی حسن کی شاعری یوں بھی تصوّف معلوم ہونے لگتی ہے۔ اصغر نے اپنی حسن کاری شاعری یا شاعرانہ حسن کاری میں تصوّف سے کام لیا ہے لیکن صرف اس حد تک جس حد

تک ان کا تصوّف ان کے مقصد کے لئے کار آمد ہو سکتا تھا اُردو شاعری میں تصوّف کو معتقدات کے دائرہ سے نکال کر حسن کا روحِ حسن آفریں اصغؔر نے بنایا۔ اصغؔر نے اپنی شاعری کا مدار تصوّف پر رکھا نہ کہ تصوّف کا شاعری پر، جس طرح اقبالؔ نے اپنی شاعری کا مدار فلسفہ پر رکھا۔ فلسفہ کا شاعری پر نہیں! اصغؔر نے بیعت کسی کی کی ہو، مرید وہ اپنی طبع حُسن شناس و حُسن شعار کے تھے۔

حسرتؔ کے یہاں زبان و بیان کی ایسی بیساختگی ملتی ہے کہ ان کے الفاظ اور تراکیب کی غرابت یا اچانک پن بھی مزہ دے جاتی ہے۔ اکثر یہ غرابت ہی ان کا نشان دیتی ہے۔ بچوں کے مانند وہ اس درجہ معصوم اور بے تکلف ہیں کہ انکا جا بجا کھل کھیلنا اور زیادہ بھلا معلوم ہونے لگتا ہے۔ سیدھی سادی بات کو بغیر کسی فلسفہ یا تنوزنیت کے مزے سے کہنا اور بس کہہ ڈالنا حسرتؔ کا حصّہ ہے۔ وہ بات کہہ کر تو خوش ہوتے ہی ہیں لیکن اس احساس سے اور زیادہ خوش ہو جاتے ہیں کہ ان کی باتوں سے دوسرے اُن سے بھی زیادہ خوش ہوئے۔ برخلاف دوسرے کم سواد شعراء کے جو بات اس طرح کہیں گے گویا دنیا میں وہی اس بات کے کہنے کے لئے بھیجے گئے تھے اور اگر ہم آپ اُسے نہ سمجھیں یا اس کی قدر نہ کریں تو اللہ کے غضب یا اردو کے ادب سے ڈریں! غزل میں توازن حسرتؔ نے پیدا کیا۔

داغؔ کا رنگ اُردو شاعری سے نہ جائیگا۔ اس لئے کہ وہ کوئی رنگ نہیں ہے بلکہ ہماری شاعری

اور ہماری زندگی کے بنیادی رنگوں میں سے ہے۔ وہ ہمیشہ کسی نہ کسی شکل میں زندگی اور زمانہ سے ساز باز کرتا ہمارے دلوں کو اپنی شوخی اور شرارت سے چھوتا چھیڑتا رہیگا۔ داغ کا یہ رنگ حسرت کے یہاں بڑے پسندیدہ انداز میں جلوہ گر ہے۔ لیکن مجھے اس بات کا بھی احساس ہے کہ ہماری زندگی سے شوخی اور شرارت رخصت ہو رہی ہے۔ جس زندگی میں تلخی اور نفرت راہ پا چکی ہو وہاں شوخی اور شرارت کا کہاں گذر! غزل گو آج بھی پیدا ہو رہے ہیں لیکن نہیں پیدا ہوتا ہے تو حسرت کا نام لیوا یہ تردد کی بات ہے۔

میرا خیال ہے کہ جگر کی شاعری سے شراب کو جتنا نفع پہنچا۔ اتنا شراب سے جگر کی شاعری کو نہیں پہنچا۔ شراب پی کر شاعری نہیں کی جاتی۔ جس طرح آج کل کے سپاہی شراب پی کر فوجی باجہ کی گت پر محاذ جنگ پر لڑنے مرنے جاتے ہیں۔ دراصل شخصیت شراب ہوتی ہے جہاں سے شاعری نشہ بن کر برآمد ہوتی ہے۔ جس طرح سے

سایۂ تاک میں ہوتی ہے ہوا موج شراب!

شراب نشہ نہیں پیدا کرتی! نشہ شراب پیدا کرتا ہے۔ جگر میں جو اضطراب و ہیجان ہے وہ شراب کا نہیں ہے "دریا بوجود خویش موجے دارد"! جو لوگ یہ بتاتے ہیں کہ شراب چھوڑ دینے سے

جگر کی شاعری کا تار و پود ڈھیلا ہوگیا۔ وہ دراصل جگر کے شراب پینے یا ترک کردینے کے واقعات پر نظر رکھتے ہیں۔ جگر کی شاعری پر غور نہیں کرتے۔ یہی مغالطہ اُن لوگوں کو ہے جو حالی کے بارہ میں کہتے ہیں کہ غزل ترک کر کے حالی شاعر نہ رہے۔ شاعری شغل نہیں شخصیت ہوتی ہے۔ حالی کی غزلوں کو دیکھ کر کون کہہ سکتا ہے کہ وہ غزل پر اکتفا کرتے۔ حالی کی غزلوں پر ان کی لبعد کی نظموں کی بڑی واضح پرچھائیں ملتی ہے۔ جگر کی شاعری دیکھ کر مجھے اکثر محسوس ہوا کہ یہ شخص شراب ترک کئے بغیر نہ رہے گا۔ جگر نے شراب کی بنیاد شاعری پر رکھی ہے، شاعری کی بنیاد شراب پر نہیں رکھی ہے میرا کچھ ایسا خیال ہے کہ شاعر کو اپنے تصوّر یا مسلک کی بنیاد شاعری پر رکھنا چاہئے اپنی شاعری کو کسی تصوّر یا مسلک پر نہ رکھنا چاہئے۔

مجھے اس خیال سے اتّفاق نہیں ہے کہ جگر جدید اردو غزل میں ایک نیا مقدر رکھتے۔ جس کی تکمیل ہو چکی۔ اور یہ مقدّر کچھ بہت مہتم بالشان مقدر نہ تھا۔ بیسویں صدی میں اردو غزل کا مقدر حسرت۔ فانی۔ اصغر و جگر چاروں کے کلام پر مشتمل تھا۔ انیسویں صدی کے خاتمہ پر ہماری غزل کو ہمارے تمدّن کے ساتھ نئے حالات اور نئے مطالبات کے گلشن اور گلخن سے گذرنا پڑا۔ اور غزل ان بیمار دلبستانوں میں جلوہ گر ہوئی جن کی طرف اوپر اشارہ کیا گیا ہے۔ بیسویں صدی کے

نصف تک پہونچتے پہونچتے ان دبستانوں میں سے اصغر اور فانی معرضِ خفا میں آ گئے۔ حسرت کے بارہ میں اُوپر عرض کر چکا ہوں کہ ان کے پیروانِ معنوی بھی معدوم ہونے لگے ہیں۔ اب صرف جگر رہ گئے ہیں۔ بذاتِ خود مجھے کچھ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ موجودہ بحرانی و ہیجانی دَور میں غزل جگر ہی کے سہارے آگے بڑھے گی۔ جگر کی شاعری میں وہ عناصر ہیں جو اس دَور کے آشوب و آزمائش میں غزل کو تب و تاب دیتے رہیں گے!
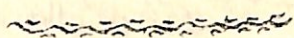
(آل احمد سرور)

جگر ایک رومانی شاعر ہیں۔ رومان کسی نہ کسی حقیقت کو ہی خوابوں میں پیش کرتا ہے
جگر کے یہاں بھی خواب اور حقیقت کی دھوپ چھاؤں نظر آتی ہے۔ جگر نے ساری عمر حسن اور
عشق کے نغمے گائے ہیں۔ حسن و عشق کا تصوّر ان کے یہاں باوجود اپنی لطافت، اپنے دھندلکے
اپنے جلووں اور اس کے پردوں کے ایک زندہ اور حقیقی تصوّر ہے۔ اُن کا عشق رومانی ہے۔ وہ
حسن کو ایک قدرِ مطلق مانتے ہیں مگر ان کے یہاں حسن ایک ماورائی پرچھائیں نہیں۔ ایک زندہ
اور تابندہ حقیقت ہے۔ جگر کے حُسن کا تصوّر اصغر کے تصوّر سے مختلف ہے۔ اگرچہ دونوں میں
کچھ مناسبت پائی جاتی ہے۔ صوفی حسن کے ایک مجرّد تصوّر سے عشق کرتا ہے۔ اُسے ساری کائنات
میں ایک ہی حسن کے مظاہر نظر آتے ہیں۔ جگر بھی اس تصوّر سے کھیلتے ہیں مگر ان کے یہاں حسن

کے ارضی و مجازی پہلو اتنے نمایاں ہیں کہ یہ روشن پرچھائیں ایک مجسّم شعلہ بن جاتی ہے۔ جگر کے یہاں حسن کا تصوّر اصغر سے زیادہ حسرت کی یاد دلاتا ہے۔ حسرت نے حقیقت میں رومان تلاش کیا۔ جگر نے حقیقت کو رومان بنا لیا۔ دونوں قدیم بھی ہیں اور جدید بھی۔ حسرت اور جگر باغی نہیں ہیں۔ وہ بیزار بھی نہیں ہیں۔ انہوں نے زندگی اور حسن کو جیسا پایا ہے بے نقاب کیا ہے۔ حسرت کے یہاں زیادہ گہرائی اس لئے نظر آتی ہے کہ اس میں نفسیاتی حقائق زیادہ ہیں۔ جگر آج سے دس سال پہلے اس گہرائی تک نہ پہنچ سکے تھے۔ مگر ایک عرصہ کی طوفانی اور جذباتی زندگی کے بعد ان کے یہاں ایک ٹھہراؤ آیا۔ انہوں نے سنجیدگی کے ساتھ اپنے سرمایہ کا جائزہ لیا۔ وہ اصغر کے اور قریب جانا چاہتے تھے۔ مگر ان کی افتادِ طبع نے انہیں حسرت کے قریب کر دیا۔ چنانچہ اس نئے مجموعہ میں جو ایک طرح جگر کے عالمِ ہوش کا کلام ہے جگر کی عشقیہ شاعری میں گہرائی اور حقیقت نظر آتی ہے۔ اس کی وجہ سے ان کی رومانیت دقیع ہو گئی ہے اور ان کا ادبی مرتبہ مستحکم۔ اس اجمال کی تفصیل ضروری ہے۔

جگر کی زندگی خاصی رنگین، دلچسپ اور پُر کیف رہی ہے۔ ان کی دیوانگی اس لئے صحت مند کہی جا سکتی ہے کہ اس میں سود و زیاں کا وہ پیمانہ نہ تھا۔ جو عام لوگوں کو دنیوی کامیابی اور

خوش حالی اور متوسط طبقے کے مشینی چکر کی طرف لے جاتا ہے۔ اُن میں اپنے جذبات و میلانات کے لئے

یہ ظاہری قربانیاں کرنے کی جرأت تھی۔ اُن کی جوانی دیوانی تھی۔ اُن کے یہاں ساقی و صہبا دونوں سے

گہری وابستگی ملتی ہے۔ اُن کی رندی اُن کی ادبی زندگی کا ایک لازمی جزو ہے۔ اس سے ان کی

شخصیت میں ایک صداقت پیدا ہو گئی ہے جو بعض بزرگوں کی رعونت اور مریض پابندیوں کے

مقابلے میں زیادہ فطری اور دلکش ہے۔ رندی اور منافقت میں ازلی بیر ہے۔ جگر منافق نہیں

ہیں۔ وہ اپنے ماضی پر شرمندہ بھی نہیں ہیں۔ صرف وہ ماضی کو پیچھے چھوڑ چکے ہیں۔ انہوں نے

عشق کیا ہے اور اس عشق کی آنچ میں جلنے اور پگھلنے سے ان کی آواز میں لے اور اُنکی شخصیت

میں گداز پیدا ہو گیا ہے۔ ان کے عشق نے انہیں اس دنیا کے حسن اور حسینوں سے عشق کرنا سکھایا

ہے یہ دوسری بات ہے کہ اس مجازی حسن میں انہیں گہرے ابتدائی نقوش کی وجہ سے ایک حسن

حقیقی کی جھلک نظر آتی ہے۔ جگر جس طبقے سے تعلق رکھتے ہیں وہ ہندوستان کے مسلمان شرفاء

کا وہ متوسط طبقہ ہے جو اب روز بروز بکھرتا جا رہا ہے۔ اور موجودہ دور کی ہوش ربا تلخیوں کی

تاب نہیں لاسکتا۔ اس طبقے کو ماضی سے محبت۔ تہذیب و شرافت کی پرستش۔ ایک مذہبی شعور

چند اخلاقی قدریں ایک مبہم سی انسانی دوستی ورثے میں ملی تھیں۔ جگر انہیں قدروں پر پلے بڑھے

جوان ہوئے تو شباب کے تقاضے اور فطرت کے مطالبے انہیں بہالے گئے۔ چنانچہ اس دور میں ان کی زندگی کے دو رُخ تھے۔ جذباتی طور پر وہ شاعری اور رندی کے پجاری تھے۔ ذہنی طور پر وہ اپنی چند قدروں کے دلدادہ ہیں جنہیں سہولت کے لئے مشرقیت کہہ لیجئے۔ یہی وجہ ہے کہ عالم ہوش میں بظاہر وہ اپنی زندگی کے بڑے بھرپور اور جاندار حصّے سے بغاوت کرتے اور اپنی ذہنی قدروں کی طرف لوٹتے نظر آتے ہیں۔ سطحی نظر سے دیکھا جائے تو جگر کی رندانہ شاعری کے مقابلے میں ان کی موجودہ شاعری بے جان اور پھیکی نظر آتی ہے لیکن انصاف کا تقاضا یہ ہے کہ ان کی رندی و ہوش دونوں کی بنیادی خصوصیات کو تلاش کیا جائے اور ان میں جو وحدت ہے اُسے نمایاں کیا جائے۔ جگر کے یہاں یہ وحدت موجود ہے، اس کے احساس کے بعد ان کی موجودہ شاعری کا صحیح مقام نظر آجاتا ہے اور ان کے عالمِ مستی اور عالمِ ہوش دونوں ایک ارتقائی سلسلے میں منسلک ہو جاتے ہیں۔

جگر کے نزدیک زندگی کی سب سے بڑی حقیقت جمال ہے اُن کے کلام میں اس جمال کے مختلف نام ہیں۔ زندگی میں جمال کی مصوّری اور فلسفۂ جمال کی پرستش میں فرق ہے۔ جمال کا احساس اچھی چیز ہے۔ جمال کی ایک قدرِ مطلق کی حیثیت سے پرستش زیادہ سے زیادہ ایک

خواب کی پرستش ہے جس کا شرمندۂ تعبیر ہونا بہت مشکل ہے۔ جگر کے مزاج میں وہ فلسفیانہ گہرائی، وہ وحدتِ ذہنی، وہ سنجیدہ فکر نہیں ہے، جو مثلاً غالب اور اقبال کے کلام میں ہے اس لئے جگر کو غالب یا اقبال کے معیار پر پرکھنا غلط ہوگا۔ وہ میر و مومن، داغ و حسرت کے دلبستان کے شاعر ہیں، ان سب شعراء کے یہاں ایک ایسی شدید جذباتیت ملتی ہے کہ وہ ان کی زندگی بن جاتی ہے مگر اس جذباتیت کو فلسفہ نہ سمجھنا چاہیئے مزاج قرار دینا چاہیئے یعنی جگر مزاج کے اعتبار سے جمال پرست ہیں وہ حسن کے پجاری ہیں اور حسن کے ادا شناس۔ ان کے عشق نے انہیں زندگی کے ہر قسم کے کامیاب اور ناکامیاب تجربات دیئے ہیں۔ انکی ناکامیوں نے انہیں فانی کی قنوطیت کی طرف مائل نہیں کیا۔ انکی کامرانیوں نے انہیں داغ کی شوخی و شرارت کے ڈھلان پر جانے سے بھی روکا۔ وہ صرف عاشق نہیں ہیں۔ عاشق شاعر ہیں لطیف اشعار کی پرچھائیوں میں زندگی کی بعض کثافتیں، مقدس اور نورانی پیکر اختیار کر لیتی ہیں، ان لطافتوں کی آب و تاب انہیں کثافتوں کی وجہ سے ہے مگر یہاں ایک کو اچھا اور دوسرے کو بُرا کہنے کے بجائے دونوں کے رشتے کو تسلیم کرنا ضروری ہے۔ جگر کے عشق میں ایک تندرست انسان کی صحت مند جنسی کشش ہے مگر یہ مریض عشق نہیں ہے اُن کی رومانیت ایک جذباتی تخیل پرست اور سریع الحس انسان کی رومانیت ہے، حسن ان کے نزدیک محض جلوہ یا محض پردہ، محض سیہ شفاف، یا محض لالہ و گل اور برق و باد

نہیں ہے، یہ سب کچھ ہے اور اس سے کچھ زیادہ۔ جگر ایک پیکرِ جمیل کو محض قاتل ہی نہیں سمجھتے پیکرِ لطیف بھی مانتے ہیں۔ وہ بانیٔ بیداد کے رنگِ رخ میں مظلوم کی فریاد کا عالم دیکھ سکتے ہیں وہ حسن کو اس وقت کامل جانتے ہیں۔ جب اس میں عشق کی گستاخ نگاہی شامل ہو جائے انکا محبوب قدیم اردو شعرا کا بیرحم، سنگدل ترکِ ستم پیشہ نہیں ہے، وہ سینے میں دل اور پہلو میں جذبات رکھتا ہے۔ وہ ظلم بھی کرتا ہے اور رحم بھی۔ بجلیاں بھی گراتا ہے اور پھول بھی برساتا ہے۔ شوخ بھی ہے اور شرمیلا بھی، آفتاب بھی ہے اور ماہتاب بھی۔ اسی وجہ سے جگر کے یہاں محبت بھی محض ایک دکھ کی داستان، ایک طویل سلسلۂ ہجراں، ایک لامتناہی غم نہیں ہے۔ اس میں چاہنے اور چاہے جانے کی لذت ہے۔ یہ شاخِ گل بھی ہے اور تلوار بھی یہ ان کی خوشی پر اپنے غم کو نثار کر دینے کا نام ہے۔ اس کا عالم اسی دنیا کا عالم ہے مگر اس سے کچھ زیادہ بھی۔ کبھی اس میں ایک ایسا وقت آتا ہے جب آنسو خشک ہو جاتے ہیں مگر طغیانی نہیں جاتی۔ کبھی صبح و شام، صبح و شام ہی نہیں معلوم ہوتے کبھی کائنات ایک ساغرِ سرشار نظر آتی ہے اور زندگی ایک نشۂ پیہم۔)

جگر کا محبت کا یہ تصور رومانی ہوتے ہوئے بھی صحت مند، وقیع اور لطیف ہے۔ یہ ہمارے تہذیبی تصور کا ایک جز ہے اس کے مطالعے سے زندگی اور کائنات کی وسعتیں کم نہیں ہوتیں، نہ زندگی بسر کرنے کا حوصلہ کم ہوتا ہے۔ زندگی اس کی وجہ سے ایک قابلِ قدر چیز ہو جاتی ہے۔ جگر کے حسن و عشق میں

روایت کا احترام موجود ہے۔ مگر یہ تصوّر محض روایت نہیں ہے۔ ان کی زندگی ہے۔ یہ شوخ ہونے ہوئے

بازاری نہیں ہے۔ یہ اخلاقی قدروں کو سمیٹ لیتا ہے مگر چند پند اور منتخب الحکایات کی خشکی سے

بچتا ہے، یہ لطیف بھی ہے اور جاندار بھی۔ اس میں مفکرانہ سنجیدگی کم ہے مگر جذبات کی گہرائی نے اسے

وہ تیز نشہ عطا کیا ہے کہ اس کا اثر دیر تک زائل نہیں ہوتا)

(مفکّرانہ سنجیدگی اور جذباتی سیلاب دونوں سے غزل میں کام لیا گیا ہے۔ لیکن یہاں یہ کہنا

ضروری ہے کہ غزل کا آرٹ دوسری چیز کے لئے زیادہ موزوں ہے۔ غالبؔ سے پہلے غزل میں تغزل،

حدیثِ دلبری یا ساغرِ سرشار کا ذکر زیادہ تھا۔ غالبؔ نے اُردو شاعری کو ایک ذہن دیا اور غزل کی رمزیت

کو کائنات کے رموز و اسرار سے آشنا کیا۔ غالبؔ سے غزل کو فائدہ بھی ہوا۔ مگر غزل کی پوری تاریخ

پر نظر ڈالنے سے واضح ہوتا ہے کہ غزل کی اصلی روایت میرؔ کی روایت ہے۔ یہاں یہ مسئلہ اہم نہیں

ہے کہ خود غزل موجودہ دور کے مزاج کی عکاسی اور اس کی ذہنی قیادت کے لئے کس قدر موزوں ہے

یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ غزل کی تاریخ اس کی روایات، اس کے مختلف موڑ، اس کے رنگ و

آہنگ کیا ظاہر کرتے ہیں۔ اس سلسلے میں مختصر طور پر یہ کہا جا سکتا ہے کہ غزل ہماری صدیوں کی

تہذیب کی سب سے اچھی نمائندگی کرتی ہے۔ غزل کے اشارے، غزل میں کھو جانے اور کچھ پا جانے

کے انداز، غزل کی لطیف اور دھندلی فضائیں اس کی نفاست اور بہتے ہوئے پانی کی روانی، ایک
کلچر اور تہذیب کی پختگی کی علامت ہیں۔ غزل کو نیم وحشیانہ صنفِ شعر کہنے والے تہذیبوں کے
سائنٹفک اور تاریخی تصوّر سے ناواقف ہیں۔ مجھے یہاں یہ کہنا نہیں ہے کہ ہماری گذشتہ
تہذیب موجودہ تہذیب و تمدّن سے بہتر یا بدتر ہے۔ مجھے تو صرف یہ یاد دلانا ہے کہ غزل ہماری
جاتی ہوئی کلچر کا عطر اور روح ہے اور اس کلچر کی سب سے اچھی نمائندگی کرتی ہے۔ یہ تہذیب جن
قدروں کی علمبردار ہے غزل میں سب کی سب آگئی ہیں۔ اس کلچر کا فروغ اس خوشحال طبقے کی یاد دلاتا
ہے جو زندگی کے مسائل کو اشاروں میں بیان کرتا ہے اور جس کے سامنے زندگی کے سخت
سے سخت مسائل لطیف اور نازک ہو کر آتے ہیں۔ حسن و عشق یہاں محض علامات نہیں ہیں۔
زندگی ہیں، اگرچہ زندگی کے ایک چھوٹے سے گوشے سے متعلق ہیں۔ یہاں شعر و شاعری کا مقصد
نہیں ہے اور اگر ہے تو ذہن کو آسودگی اور تازگی دینا۔ یہاں رندی و احتساب کا تذکرہ، شعر و
شاعری کی دُنیا میں اپنے لئے وہ آزادی تلاش کرنا ہے۔ جو زندگی میں بعض مذہبی بندشوں کی وجہ سے
نہیں ملتی۔ یہ تہذیب مذہب کی بعض قدروں کا احترام کرتی ہے مگر مذہبی نہیں ہے اس نے
اسلام کے ساتھ کچھ کم کھلنڈرا پن نہیں کیا ہے اور دیر و کلیسا کو محض یو نہیں نہیں برتا ہے۔ اگر

بے لاگ اور سائنٹفک نظر سے دیکھا جائے تو غزل میں ہماری ہندوستانی تہذیب و تمدّن کی صدیوں کی داستان ملتی ہے۔ یہ تہذیب ایران و توران سے بعض نام اور علامات لیتی ہے اور کیوں نہ لیتی۔ جب وہاں کے لالہ زاروں کے پھولوں سے بھی یہ اپنے نگار خانوں کو سجاتی رہی تھی۔ مگر یہ ہے ہندوستانی اور ہندوستان کی آب و ہوا اس کے مزاج، اس کی قومی خصوصیات کی علمبردار۔ اس غزل اور اس کی نمایندہ تہذیب کے لئے موجودہ مغربی اور سائنٹفک تہذیب یقیناً ایک خطرہ ہے۔ لیکن اس وجہ سے ہمیں موجودہ غزل گو شعرا کی روایات اور ان کے مخصوص طرزِ فکر کو نظر انداز نہیں کرنا چاہیئے۔ جگر کی شاعری کے مطالعے کے وقت پہلے یہ سوالات رکھنے چاہئیں کہ غزل انتشار خیال اور پراگندگی کو ترقی دیتی ہے یا غزل واضح اور روشن خیالات سے دُور رہتی ہے۔ پہلے یہ سوچنا چاہیئے کہ جگر کے یہاں کوئی منفرد کارنامہ، کوئی انوکھی آواز۔ کوئی اہم نقش ایسا بھی ہے جو ان سے پہلے یا تو نہ ہو، یا ان کی وجہ سے روشن ہو گیا ہو۔ اس کے بعد اس نقش کی رنگینی اور حسن اور شاعری میں اس کی اہمیت کا سوال آئیگا۔ جگر کا تغزل غزل کا جانا پہچانا تغزل ہے۔ حالیؔ یا اقبالؔ کے تجربات جگر کی شاعری میں ڈھونڈنے کی زیادہ گنجائش نہیں۔ جگر جس ماحول اور طبقے سے تعلق رکھتے ہیں۔ وہ داغ، امیر اللہ تسلیم اور رسا کا ماحول ہے۔ یہ اپنی روایات کا احترام

کرتا ہے۔ مگر اپنے زمانے کی زندگی اور اس کے حسن کا ادا شناس بھی ہے۔ یہ نہ صوفیوں کی طرح دُنیا کو تج دینا چاہتا ہے اور نہ حکیموں اور فلسفیوں کی طرح پہیلیاں بُجھواتا ہے۔ یہ حسن اور جمال کا اس وجہ سے اور بھی دلدادہ ہے کہ اس میں ذہنی تسکین کا سارا سامان موجود ہے۔ جگر کی شاعری کا مطالعہ میر۔ مومن۔ حسرت، داغ کی روشنی میں کرنا چاہئے۔ لیکن انصاف کا تقاضا یہ ہے کہ (جگر کی آواز اس برادری میں صرف ایک ہلکی سی آواز بازگشت نہیں ہے۔ اپنی لے اور اپنا زیرو بم بھی رکھتی ہے۔)

(جگر کی مقبولیت اور شہرت کو عام طور سے نقادوں نے تسلیم کیا ہے۔ ان کے تغزل، ان کی رندی و سرمستی، ان کے لطیف اشارات اور دلکش کنایات، ان کی حسن پرستی اور حسن کاری سے کسی کو انکار نہیں۔ لیکن نگار کے نقاد نے اُن کے یہاں "دعوت فکر کم اور دعوت کام و دہن زیادہ پائی ہے"۔ مجنوں نے انہیں مشاعرے کا شاعر بتایا ہے اور ان کی شاعری کو ہلکی پھلکی جذباتی شاعری قرار دیا ہے۔ یہاں یہ کہنا ضروری ہے۔ کہ ان اشخاص نے غزل کے فن اور مزاج اس کی تاریخ اور اس کی روایات کو نظر انداز کیا ہے۔ کوئی بھی ادبی صنف تجربات کے لئے اپنا دامن وسیع رکھنے کے باوجود اپنی روایت اور تاریخ سے بے نیاز نہیں ہوسکتی۔ غزل میں فکر

کے لئے گنجائش ہے مگر اسے جذبہ بن کر آنا چاہئے۔ اور میرا خیال یہ ہے کہ اچھی اور سچی شاعری میں بھی محض فکر سے کام نہیں چلتا اسے جذباتی گرمی چاہئے۔ غزل میں غالبؔ نے سب سے پہلے فکر کو جگہ دی مگر غزل میں اس مفکرانہ سنجیدگی کی گنجائش نہیں ہے جو نظم کے لئے موزوں ہے۔ غالبؔ حالیؔ اور اقبالؔ کے چند تجربات کے باوجود اچھی غزل میں لطیف اشارے ضروری ہیں۔ غزل پرچھائیوں سے روشن ہے، اسے دن کی دھوپ پسند نہیں۔ ہماری شاعری کی صحت مند روش اس سے ظاہر ہوتی ہے کہ آزادؔ اور حالیؔ کے بعد سے ہمارے یہاں نظم کے ذریعے سے سنجیدہ مقصدی شاعری کی گئی ہے۔ نظم کی تعمیر، اس کا ربط و تسلسل، اس کی آزاد فضا، بڑے سے بڑے اور گہرے سے گہرے خیال کو تفصیل سے بیان کرنے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔ غزل کے اشارات اس کی چلتی پھرتی تصویریں ہماری معلومات میں اضافہ نہیں کر سکتیں۔ ہمارے جذبات میں گرمی و لطافت پیدا کر سکتی ہیں۔ نگار کے نقاد کا خیال ہے کہ مستقبل کی زندگی غزل کی آواز پر آواز دیگی۔ میں اتنا خوش فہم نہیں ہوں۔ میرا خیال ہے کہ غزل کے آرٹ کو آپ تھوڑا بہت بدل سکتے ہیں مگر اسے نظم نہیں بنا سکتے۔ نہ بنانا چاہئے۔ ہاں غزل کے اثر سے نظموں میں تعمیر اور تسلسل کا خون کر سکتے ہیں۔ اقبالؔ کی بہت سی مشہور نظموں میں یہ اثر موجود ہے۔ "شمع و شاعر" جو بانگ درا کی مشہور نظموں میں

ہے اس اثر کو اچھی طرح ظاہر کرتی ہے۔ خضر راہ سے اقبال نے صحیح معنی میں نظم کہنی سیکھی۔ جوش کی نظموں میں اب بھی غزل کے اثرات ملتے ہیں۔ وہ سریع اور مسلسل خیالات پیش نہیں کرتے۔ مختلف تصویروں کی کثرت سے ذہن پر ایک مجموعی اثر چھوڑ جاتے ہیں۔ ان کی کئی اچھی نظموں میں ایک ہی خیال کو مختلف پہلوؤں یا مختلف تشبیہوں یا استعاروں سے ادا کیا گیا ہے۔ خیال میں ترقی یا جامعیت نہیں ہے۔ اقبال یا جوش کی مثال اس لئے دی گئی کہ غزل اور نظم دونوں میں ایک ہی فن "تلاش نہیں کرنا چاہئے۔ غزل کا آرٹ ایک مخصوص تہذیب میں پختہ ہوا ہے اس آرٹ کے لئے ایک روشن مستقبل کی پیشین گوئی کرنا، اس مستقبل کے روشن ہونے کی اچھی دلیل نہیں ہے اور نہ پیشین گوئی کی عادت اچھی چیز ہے۔ فانی اور جگر جب غزل اور نظم میں فرق کرتے ہیں اور غزل کہنے والے کو شاعر اور نظم کے پرستار کو ناظم کہتے ہیں تو وہ دونوں کے بنیادی فرق کو واضح کرنے میں غلطی نہیں کرتے، غلطی وہ غزل کے شاعر کو ترجیح دینے میں کرتے ہیں۔ نظم کہنے والا غزل گو شاعر سے کسی طرح کم درجے کا شاعر نہیں ہے بلکہ اگر غور سے دیکھا جائے تو وہ اپنے جدید ذہن اور نئے ادبی شعور کی وجہ سے غزل سے بہتر، جامع اور ترقی یافتہ صنف کا علمبردار ہے۔ غزل کے ذریعہ سے ہم موجودہ نسلوں کی ذہنی عکاسی تو کر سکتے ہیں۔ مگر اس کی قیادت نہیں کر سکتے۔ نظم اس ذہنی قیادت

کے لئے زیادہ موزوں ہے۔ ادب کو ہم زندگی کا آئینہ ہی نہیں کہتے۔ زندگی کو سدھارنے اور سنوارنے کا ذریعہ سمجھتے ہیں۔ ہم شاعری کو پیمبری مانتے ہیں۔ غزل میں یہ پیمبری ممکن نہیں۔ اس کے لئے نظم کی وسعتیں اور گہرائیاں زیادہ موزوں ہیں، غزل کے شاعر پر یہ بوجھ رکھا جائے تو یہ اُسے نہیں اٹھا سکے گا۔ وہ بعض مخصوص لمحات میں بعض اشارات کے ذریعے سے اس پیمبری تک پہنچ سکتا ہے۔ مگر اس کا آرٹ اُسے زیادہ دیر تک اس بلندی پر نہیں رہنے دیگا۔ غزل کا کمال یہ ہے۔ (کہ وہ اچھا آئینہ ہے۔ آئینہ کی اہمیت سے انکار کرنا بھی کفر ہے اور آئینے کو انجمن سمجھنا بھی۔)

اس لئے جگر کی شاعری میں اگر دعوتِ فکر کم ہے تو اس وجہ سے کہ وہ غزل کے شاعر ہیں، وہ اپنی غزلوں کی وجہ سے زندہ رہیں گے اپنی نظموں کی وجہ سے نہیں۔ ان کے مزاج میں اور نظم کے فن میں مناسبت نہیں ہے اسی وجہ سے ان کی نظموں میں غزل کی خوبیاں اور خامیاں ملتی ہیں۔ نظم کی خوبیاں اور خامیاں نہیں ملتیں۔ دعوتِ فکر نے فانی کی یاسیات کو قنوطیت بنا دیا۔ میر نے اس فکر سے اپنا دامن بچایا۔ اسی وجہ سے میر فانی کا سا مہذب شعور نہ رکھتے ہوئے بھی فانی سے بڑے شاعر ہیں اور جگر کی غزل، فانی کی گہرائی، اُن کی انفرادیت، ان کی نشتریت کو نہ پہنچتے ہوئے بھی، ہمارے لئے زیادہ صحت مند، رنگین، دلکش اور جاندار ہے۔

(فانی کی طرح جگر نے کبھی موت کو امین نہیں سمجھا - انہوں نے کبھی شبِ غم کی پرستاری نہیں کی۔ انہیں زہرِ غم سے محبت کبھی نہیں ہوئی۔ عرفانِ غم سے ہوئی) اصغر کی لطافت، ان کی روحِ نشاط ان کا انبساطِ ذہنی جو ہمیں اس دُنیا اور اس کی لطیف مادّیت سے الگ کرتا ہے۔ جگر کے بس کی بات نہیں۔ جگر جب اصغر کی تقلید کرتے ہیں تو وہ اپنی عظمت کو نہیں سمجھتے۔ اصغر کی لطافت تک پہنچنا ہر ایک کے بس کی بات نہیں ہے۔ اس کے لئے ایک رچے ہوئے مہذب شعور کے علاوہ تھوڑے سے ماورائی اندازِ نظر کی بھی ضرورت ہے۔ جگر کی شاعری پڑھے لکھے عوام کی سمجھ میں آسکتی ہے (۔ اُن کے جذبات کی دھڑکن اس میں موجود ہے۔ ان کی داستانِ حیات کے نقوش اس میں بکھرے پڑے ہیں۔ ان کی محرومیوں اور کامرانیوں، ان کے عیش و غم سے اس میں زندگی آئی ہے۔ جگر کے یہاں جو لذتیت ہے وہ داغ سے زیادہ مہذب ہے اور مومن سے کم نقاب پوش (۔ اس میں لذّت پرستی کی تلقین نہیں ملتی۔ زندگی اور اس کے حسن کی چاشنی ہے۔ مجنوں نے جس کو ہلکی پھلکی جذباتی شاعری کہا ہے اس میں وزن کم سہی مگر لطافت کی کمی نہیں) غزل دراصل فنِ لطیف ہی ہے جگر کے یہاں جو رنگِ مشاعرہ یا رنگِ محفل ہے اُسے بھی میں بُری چیز نہیں سمجھتا۔ ترقی پسندوں کے ایک بہت بڑے مشاعرے میں جو دسمبر ۱۹۴۷ء میں

لکھنؤ میں ہوا تھا۔ جگر کی ایک غزل کے سامنے دوسرے شعرا کی نظمیں اور غزلیں بلا وجہ ماند نہیں پڑگئی تھیں۔ اس غزل کا مطلع یہ ہے ؎

فکرِ جمیل خواب پریشاں ہے آج کل شاعر نہیں ہے وہ جو غزل خواں ہے آجکل

اس غزل میں جسے نظم سمجھا گیا ہے جگر نے ایک زندہ احساس کا ثبوت دیا ہے۔ عمر کی پختگی اور جذباتی طوفانوں کے تھپیڑاؤں نے جگر کو فرار نہیں سکھایا۔ اُسے زندگی کے دُکھ درد سے قریب کر دیا۔ اُن کے غم میں غمِ زمانہ آگیا۔ یہ معمولی بات نہیں ہے۔

جگر جدید نہیں ہیں۔ وہ ایک معنی میں ابدی (AGELESS) ہیں۔ اس کا یہ مطلب نہیں کہ جگر کی قدریں ابدی ہیں یا ہیں ابدی قدروں کا قائل ہوں۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ جگر جن جذبات کو متاثر کرتے ہیں۔ جن تاروں کو چھیڑتے ہیں۔ جو نغمہ الاپتے ہیں اس کی نغمگی بڑی دیرپا اور پائدار چیز ہے۔ میں اس بات کو ایک مثال سے واضح کر دوں۔ فراق کی غزل جدید ہے اس میں جدید ذہن کی کارفرمائی ملتی ہے۔ اس سے غزل میں ایک خوشگوار اضافہ ہوا ہے۔ جو موجودہ دَور، اُس کی الجھنوں اور اس کی منزلوں کو جانتے اور سمجھتے ہیں وہ غزل کو ایک نیا احساس بھی دیتے ہیں مگر ان کے یہاں اُتار چڑھاؤ بہت ہے۔ پست و بلند ان کے یہاں زیادہ ہیں، ہمواری کم

ہے، مگر تغزل کے لحاظ سے جگر ان سے بہتر ہیں۔ فراق نے غزل کو جدید ذہن دیا۔ جدید ذہن کو
خوشگوار اور ہم آہنگ رچاؤ نہیں دیا۔ جگر کے یہاں ایک ہم آہنگی اور رچی ہوئی کیفیت ملتی ہے
جو جدید نہ سہی۔ مہذب، حساس اور بیدار ہے۔ فراق کی زبان میں وہ روانی نہیں ہے، وہ نکھری
اور ستھری کیفیت نہیں ہے، وہ والہانہ پن نہیں ہے جو جگر میں ہے، ان کے یہاں وہ ہمواری بھی
نہیں ہے جو مثلاً جذبی، مجاز، فیض کی غزلوں میں ملتی ہے۔ جدید اور قدیم کی خوشگوار آمیزش
غزل میں معمولی کام نہیں ہے (اس میں خونِ جگر پینا پڑتا ہے۔ غزل میں فراق کی اہمیت مسلّم ہے
مگر وہ دُھلی دُھلائی چاندنی جو جگر کے اشعار میں ہے فراق کے یہاں نہیں۔)

جگر کے یہاں تغزل اور سرمستی کی طرف میں اشارہ کر چکا ہوں لیکن تغزل اور سرمستی تو دوسروں
کے یہاں بھی ہے۔ آخر جگر کی انفرادیت کیا ہے؟ جگر کی اپنی آواز کون سی ہے؟ وہ تھرتھراہٹ، وہ
لے کیا ہے جسے ہم ہزاروں آہٹوں اور کروٹوں میں پہچان لیں؟ جگر نے عشق کی انانیت اور خودداری
پر بار بار زور دیا ہے۔ جگر کے یہاں کبھی کبھار عاشق خود محبوب بن گیا ہے۔ یہ دراصل ذہن کا وہ
جادو ہے۔ تخیل کا وہ طلسم ہے جس میں کبھی کبھار عاشق اور شاعر اسیر ہو جاتا ہے۔ اس قسم کے اشعار
کافی ہیں مگر یہ جگر کا بڑا کارنامہ نہیں ہے۔ جگر کے یہاں عشق کی نفسیات بھی ملتی ہیں۔ توجہ بے نہایت

اور نظر کم تسکین ہے اور تسکین نہیں، آرام ہے اور آرام نہیں۔ وہ آنسو جو نظر نہیں آتے۔ جگر کی داستان کو عام انسانی تجربے کے ساتھ روح انسانی کے مخصوص کیفیات سے بھی آشنا ثابت کرتے ہیں۔ پھر بھی جگر کے اصلی رنگ کو سمجھنے کے لئے ان کے یہ چند اشعار دیکھئے:۔

حسن کے ہر جمال میں پنہاں
میری رعنائی خیال بھی ہے

نازک سی توجہ میں اشارات کے دفتر
ہلکے سے تبسّم میں کنایات کا عالم

تو محبّت کو لازوال بنا
زندگی کو اگر نہیں ہے ثبات

اے کمال سخن کے دیوانے
ماورائے سخن بھی ہے اک بات

اُٹھتی نہیں ہے آنکھ مگر اُس کے رُوبرو
نادیدہ اک نگاہ کئے جا رہا ہوں میں

حسین و سادہ ہے کس درجہ فطرتِ شاعر
ہنسے تو غنچہ و گل، رو پڑے تو شبنم ہے

اللہ رے بے بسی کہ غمِ روزگار بھی
بیٹھا ہوں تیرے غم کے برابر لئے ہوئے

ہشیار اے نگاہِ ستم آشنائے دوست
دل بھی ہے اک لطیف سا نشتر لئے ہوئے

وہ یوں دل سے گذرتے ہیں کہ آہٹ تک نہیں ہوتی
وہ یوں آواز دیتے ہیں کہ پہچانی نہیں جاتی

اللہ اللہ ہستی شاعر   قلب غنچے کا آنکھ شبنم کی

جگر کی شاعری یہی ہے۔ جگر نے اردو غزل کی ساری صالح روایات کو جذب کر کے انہیں ایک لطیف تبسم اور دلکش رمز بنا دیا ہے۔ اس کی معنویت، رمزیت اور تاثیر میرؔ، مومنؔ، داغؔ، حسرتؔ سے آشنا ہوئے بغیر واضح نہیں ہوتی۔ مگر ان روایات کے ساتھ اور ان کے باوجود ایک نئی صحت مند، شگفتہ اور پُر کیف اشاریت رکھتی ہے جو اس کی اپنی ہے۔ حسرتؔ و جگر سے غزل کو وہ سرمستی واپس مل گئی۔ جو زندگی کی تلخیوں میں کھو گئی تھی۔ وہ کیف و انبساط پھر ہاتھ آ گیا جو زندگی کی رُوح ہے اور جس کی وجہ سے زندگی روشن اور گوارا ہے۔ جگرؔ، داغؔ و حسرتؔ دونوں سے زیادہ مہذب اور لطیف تغزل رکھتے ہیں۔ حسرتؔ کی شاعری میں زندگی ہے جگر کی زندگی میں شاعری۔ جگر کے یہاں محبّت کا تصوّر ایک پاکیزہ اور لطیف تصوّر ہے۔ مگر وہ تصوّر زندگی سے دُور نہیں لے جاتا، زندگی کرنے کا حوصلہ عطا کرتا ہے۔ جگر کا جنون۔ حوصلہ اور جد و جہد سکھاتا ہے۔ جگر کے شبستان میں محبوب کے لطف و کرم سے روشنی ہے۔ جگر نے خود بھی محبت کی ہے اور ان سے محبت بھی کی گئی ہے۔ جگر کے لطیف نشتروں سے لطف اٹھانے کے لئے اردو شاعری کی رمزیت اور اشاریت کا علم ضروری ہے۔ جگر کے رومانی تصوّر سے حقیقت رنگین ہو جاتی ہے۔ وہ زندگی کو ہاں

کہتے ہیں نہیں نہیں کہتے۔ ان کے تصوف اور ان کی مشرقیت کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ مگر سب

سے زیادہ اہم ان کی مہذب رندی ہے۔

اس رندی کی وجہ سے دیر و حرم کے بجائے وہ مے کدے میں پناہ لیتے ہیں اسی کی وجہ

سے وہ اپنے دور کے اہم واقعات سے متاثر ہوتے ہیں اور بنگال، چھپرا، تقسیم ہند کے بعد ملک کے

فسادات اور ہندوستان میں موجودہ حکومت کے قول و فعل میں تضاد سے کڑھتے ہیں۔ یہ معمولی

بات نہیں ہے کہ غزل کا شاعر، ملک کے ان حالات سے متاثر ہوا ہے۔ ان کا یہ شعر یوں نہیں نہیں

ہے۔ ترقی کے وعدوں اور رفعت کی زندگی پر بڑی اچھی طنز ہے ؎

زمانہ گرم رفتار ترقی ہوتا جاتا ہے   مگر اک چشم شاعر ہے کہ پُر نم ہوتی جاتی ہے

وہ جب دیکھتے ہیں کہ دلوں کی جراحتوں کے چمن کھلے ہوئے ہیں تو فریاد کئے بغیر نہیں رہ سکتے۔ وہ

ملک میں تنگ نظری، منافقت، تعصّب، جہالت سے بیزار ہیں۔ یہ شبنمی آنکھ شعلے نہیں پیدا کر سکتی

اسے نفرت عزیز نہیں۔ یہ گلشن پرست ہے اور کانٹوں سے بھی نباہ کرنا جانتی ہے۔ یہ یاروں کی یار ہے

اور اس کا مسلک محبت ہے۔ یہ اپنی بہاروں سے مایوس نہیں ہے۔ اسی وجہ سے اسکا اشارہ یہ ہے

چمن کے مالی اگر بنا لیں موافق اپنا شعار اب بھی   چمن میں آ سکتی ہے پلٹ کر چمن سے روٹھی بہار اب بھی

اسی محبت اور رندی نے ان سے کہلوایا ہے۔

یہی زمیں ترا مسکن یہی ترا مدفن　　اسی زمیں سے تو مہر و ماہ پیدا کر

ہیں وہ صاف صاف کہدوں جو ہے فرق مجھ میں تجھ میں

ترا درد دردِ تنہا، مرا غم غمِ زمانہ

جنوں کی بے سر و سامانیوں پہ رنج نہ کر　　اگر جنوں ہے سلامت ہزار ہا دامن

کھلا بابِ زنداں تو کیا اس سے حاصل　　کہ خود زندگی بن گئی قید خانہ

جگرؔ گزشتہ دس سال ہی اپنے قبۂ نور میں بند نہیں رہے انہوں نے اس زندگی کے نور و نار کو بھی دیکھا ہے اس کی گرمی اور روشنی، اس کی تلخی اور بے مہری کو بھی محسوس کیا۔ جگر کا دل صحیح جگہ پر ہے اگر ان کو اپنے مخصوص دائرے کے علاوہ دوسرے اربابِ فکر و نظر سے ملنے کا موقع ملتا۔ اگر وہ گونڈے کے سرد و بے رنگ ماحول کے بجائے کسی بڑے شہر کے رواں دواں، علمی و ادبی ماحول ہی ہوتے اگر موجودہ تحریکات کے اثر کو شاعر کی طرح قبول کرنے کے بجائے ایک انسان کی حیثیت سے قبول کرتے تو اُن کے ذہن کو اور جلا ہوتی۔ ان کے یہاں ان کے دور کی روح اور زیادہ جھلکتی، نئی نسلوں کو وہ اور زیادہ سمجھتے اور نئی نسلیں انہیں اور اپنے سے قریب پاتیں لیکن ان باتوں کے باوجود یہ واقعہ ہے کہ جگر

کے لطیف اشاروں اور حدیثِ دلبری میں ہماری موجودہ زندگی کے نقش و نگار ملتے ہیں ان کی محبّت شاخِ گُل بھی ہے اور تلوار بھی۔

میں نے جگر کے اشعار کا زیادہ انتخاب کرنے سے قصداً احتراز کیا ہے۔ اس مقدمے کا مقصد جگر کی شاعری کے مقام اور اہمیت کا تعین ہے لیکن آخر میں ان نشتروں کی طرف اشارہ کرنا ضروری ہے جو اُردو غزل کے ہر سخت اور کسی مختصر انتخاب میں بھی جگہ پا سکتے ہیں۔

گداز عشق نہیں کم جو میں جواں نہ رہا ۔ وہی ہے آگ، مگر آگ میں دھواں نہ رہا

لہو آتا نہیں کچھ کرمژہ تک ۔ نہ آئے گی بہار اب کی برس کیا

جب کوئی حسین ہوتا ہے سرگرمِ نوازش ۔ اس وقت وہ کچھ اور بھی آتے ہیں سوا یاد

کیا لُطف کہ میں اپنا پتہ آپ بتاؤں ۔ کیجے کوئی بھولی ہوئی خاص اپنی ادا یاد

بیٹھے ہیں بزمِ دوست میں گمشدگانِ حسنِ دوست
عشق ہے اور طلب نہیں، نغمہ ہے اور صدا نہیں

اُٹھتی نہیں نگاہ مگر ان کے روبرو ۔ نادیدہ اک نگاہ کئے جا رہا ہوں میں

یوں زندگی گزار رہا ہوں ترے بغیر ۔ جیسے کوئی گناہ کئے جا رہا ہوں میں

بے کیف دل ہے اور جئے جا رہا ہوں میں ۔۔۔ خالی ہے شیشہ اور پئے جا رہا ہوں میں

وہ دل کہاں ہے اب کہ جسے پیار کیجئے ۔۔۔ مجبوریاں ہیں، ساتھ دئے جا رہا ہوں میں

یہ حسن ہے کیا، یہ عشق ہے کیا، کس کو ہے خبر اس کی لیکن

بے جام ظہورِ بادہ نہیں، بے بادہ فروغِ جام نہیں

صد عشرتِ نگاہ مسلسل خوشا نصیب ۔۔۔ لیکن لطافتِ نگہہ مختصر کہاں

جو ہیں خاص چشم و چراغِ محبت ۔۔۔ وہ آنسو نہیں ہیں نظر آنے والے

محبت میں اک ایسا وقت بھی دل پر گزرتا ہے!

کہ آنسو خشک ہو جاتے ہیں طغیانی نہیں جاتی

لاکھ آفتاب پاس سے ہو کر گزر گئے ۔۔۔ بیٹھے ہم انتظارِ سحر دیکھتے رہے

تیرے بغیر رونق دیوار و در کہاں ۔۔۔ شام و سحر کا نام ہے، شام و سحر کہاں

عرصہ ہوا کہ رسم محبت بدل گئی ۔۔۔ دامن سے اب معاملۂ چشم تر کہاں

وہ ہزار دشمنِ جاں سہی، مجھے پھر بھی غیر عزیز ہے

جسے خاکِ پا تری چھو گئی، وہ برا بھی ہو تو برا نہیں

رشید صاحب کا قول ہے کہ کوئی نامعقول انسان معقول شاعر نہیں ہو سکتا۔ بات صحیح ہے لیکن سارا پھیر معقولیت اور نامعقولیت کے تعین کا ہے۔ رشید صاحب معقول اور نامعقول کا ذاتی، شخصی اور محدود اور

بندھا ٹکا تصوّر رکھتے ہیں، میں اسے اضافی سمجھتا ہوں۔ ممکن ہے کوئی شخص بڑا معقول باتیں کہتا ہو یا وہ خود نامعقول ہو لیکن اس کی شاعری میں معقولیت ہو۔ بہر حال جگرؔ صاحب ایک پاکیزہ شخصیت، ایک حسّاس دل، ایک دردمند نگاہ رکھتے ہیں اُن کی شاعری میں خلوص ہے اُن کی شاعری کے مطالعے کے بعد زندگی کا نشہ کچھ بڑھ جاتا ہے، یہ کائنات کچھ اور حسین ہو جاتی ہے یہ حسن اُن کی شخصیت اور صداقت کی یک رنگی سے آیا ہے۔ جگرؔ کے یہاں جو کچھ ہے وہ خونِ جگر سے لکھا گیا ہے۔ یہاں خلوص بھی ہے وارفتگی پن یا سپردگی بھی اور ایک آب و تاب بھی۔ جگرؔ کا یہ والہانہ پن معمولی چیز نہیں۔ ہم اس میں ڈوب کر کونین کی بعض قابلِ قدر نعمتوں سے آشنا ہوتے ہیں۔ جگرؔ کا عشق کا تصوّر اگرچہ اقبالؔ کے تصوّر کی گہرائی نہیں رکھتا۔ مگر لطافت میں اقبالؔ سے کم نہیں۔ جگرؔ نے غزل کی لطافت کو قائم رکھا ہے اور اس لطافت سے اُردو شاعری کے کیف و انبساط کو بڑھایا ہے۔ جگرؔ کے یہاں زندگی محض روحِ نشاط نہیں ہے، خود نشاط ہے۔ ہماری جدید شاعری زندگی کے اس نشاط کو بعض حقائق کی وجہ سے کھوتی جا رہی ہے اور اسی وجہ سے جگرؔ کے یہاں زندگی اور اس کے حسن کے ساتھ یہ والہانہ شغف ایک صحت مند علامت ہے۔ اُردو شاعری کو اس کی آج بھی ضرورت ہے اور یہ ضرورت ہمیشہ رہیگی۔

غزلیات

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

(۱)

ہر حقیقت کو باندازِ تماشا دیکھا
خوب دیکھا ترے جلووں کو مگر کیا دیکھا

جستجو میں تری یہ حاصلِ سودا دیکھا
ایک اک ذرّہ کا آغوشِ طلب وا دیکھا

آئینہ خانۂ عالم میں کہیں کیا دیکھا
تیرے دھوکے میں خود اپنا ہی تماشا دیکھا

ہم نے ایسا نہ کوئی دیکھنے والا دیکھا
جو یہ کہدے کہ ترا حُسن سراپا دیکھا

دلِ آگاہ میں کیا کہیئے جگرؔ کیا دیکھا
لہریں لیتا ہوا اک قطرے میں دریا دیکھا

کوئی شائستہ و شایانِ غمِ دل نہ ملا
ہم نے جس بزم میں دیکھا اُسے تنہا دیکھا

(۲)

یادش بخیر، جب وہ تصوّر میں آ گیا
شعر و شباب و حُسن کا دریا بہا گیا

جب عشق اپنے مرکزِ اصلی پہ آ گیا
خود بن گیا حسین، دو عالم پہ چھا گیا

جو دل کا راز تھا اسے کچھ دل ہی پا گیا
وہ کر سکے بیاں، نہ ہمیں سے کہا گیا

ناصح فسانہ اپنا ہنسی میں اڑا گیا
خوش فکر تھا کہ صاف یہ پہلو بچا گیا

اپنا زمانہ آپ بناتے ہیں اہلِ دل
ہم وہ نہیں کہ جن کو زمانہ بنا گیا

دل بن گیا نگاہ، نگہ بن گئی زباں
آج اِک سکوتِ شوق قیامت ہی ڈھا گیا

میرا کمالِ شعر بس اتنا ہے اے جگر
وہ مجھ پہ چھا گئے، میں زمانے پہ چھا گیا

(۳۱)

کوئی جیتا، کوئی مرتا ہی رہا
عشق اپنا کام کرتا ہی رہا

جمع خاطر کوئی کرتا ہی رہا
دِل کا شیرازہ بکھرتا ہی رہا

غم وہ میخانہ، کمی جس میں نہیں
دل وہ پیمانہ، کہ بھرتا ہی رہا

حُسن تو تھک بھی گیا، لیکن یہ عشق
کارِ معشوقانہ کرتا ہی رہا

وہ مٹاتے ہی رہے، لیکن یہ دِل
نقش بن بن کر اُبھرتا ہی رہا

دھڑکنیں دل کی سبھی کچھ کہہ گئیں
دل کو میں خاموش کرتا ہی رہا

تم نے نظریں پھیر لیں تو کیا ہوا
دل میں اک نشتر اُترتا ہی رہا

(۹)

گدازِ عشق نہیں کم، جو میں جواں نہ رہا
وہی ہے آگ، مگر آگ میں دھواں نہ رہا

نہیں، کہ دل مرا وقفِ غمِ نہاں نہ رہا
مگر وہ شیوۂ فرسودۂ بیاں نہ رہا

زہے وہ شوق جو پابندِ ایں و آں نہ رہا
خوشا وہ سجدہ جو محدودِ آستاں نہ رہا

حجابِ عشق کو اے دل بہت غنیمت جان
رہے گا کیا جو یہ پردہ بھی درمیاں نہ رہا

چمن تو برقِ حوادث سے ہو گیا محفوظ
مری بلا سے۔ اگر میرا آشیاں نہ رہا

جنونِ سجدہ کی معراج ہے یہی شاید
کہ تیرے در کے سوا کوئی آستاں نہ رہا

کمالِ قُرب بھی شاید ہے عینِ بُعد جگر
جہاں جہاں وہ ملے، ہیں وہاں وہاں نہ رہا

(۵)

دل کو سکوں، رُوح کو آرام آگیا
موت آگئی کہ دوست کا پیغام آگیا

جب کوئی ذکرِ گردشِ ایّام آگیا
بے اختیار لب پہ ترا نام آگیا

غم میں بھی سرُور، وہ ہنگام آگیا
شاید کہ دورِ بادۂ گلفام آگیا

دیوانگی ہو، عقل ہو، اُمید ہو کہ یاس
اپنا وہی ہے وقت پہ جو کام آگیا

دل کے معاملات میں ناصح! شکست کیا
سَو بار حُسن پر بھی یہ الزام آگیا

صیّاد شادماں ہے مگر یہ تو سوچ لے
میں آگیا کہ سایہ تہ دام آگیا

دل کو نہ پُوچھ معرکۂ حُسن و عشق میں
کیا جانئے غریب کہاں کام آگیا

یہ کیا مقامِ عشق ہے ظالم کہ ان دنوں
اکثر ترے بغیر بھی آرام آگیا

احباب مجھ سے قطع تعلق کریں جگر
اب آفتابِ زیست لبِ بام آگیا

(۶)

شعر و نغمہ، رنگ و نکہت، جام و صہبا ہو گیا
زندگی سے حُسن نکلا اور رسوا ہو گیا

اور بھی آج اور بھی ہر زخم گہرا ہو گیا
بس کر اے چشمِ پشیماں کام اپنا ہو گیا

اس کو کیا کیجے، زبانِ شوق کو چُپ لگ گئی
جب یہ دل شائستۂ عرضِ تمنّا ہو گیا

اپنی اپنی وُسعتِ فکر و یقیں کی بات ہے
جس نے جو عالم بنا ڈالا وہ اُس کا ہو گیا

ہم نے سینے سے لگایا دل نہ اپنا بن سکا
مُسکرا کر تُم نے دیکھا، دل تمہارا ہو گیا

میں نے جس بُت پر نظر ڈالی جنونِ شوق میں
دیکھتا کیا ہوں، وہ تیرا ہی سراپا ہو گیا

اُٹھ سکا ہم سے نہ بارِ التفاتِ ناز بھی
مرحبا، وہ جس کو تیرا غم گوارا ہو گیا

وہ چمن میں جس روش سے ہو گئے گذرے بے نقاب
دفعتاً ہر ایک گُل کا رنگ گہرا ہو گیا

شش جہت آئینۂ حُسنِ حقیقت ہے جگر!
قیس دیوانہ تھا، محوِ روئے لیلےٰ ہو گیا

(۷)

رو بروئے دوست ہنگامِ سلام آ ہی گیا   رخصت اے دیر و حرم، دل کا مقام آ ہی گیا

منتظر کچھ رند تھے جس کے، وہ جام آ ہی گیا   باش اے گردوں کہ وقتِ انتقام آ ہی گیا

ہر نفس خود بن کے میخانہ بہ جام آ ہی گیا   توبہ جس سے کانپتی تھی وہ مقام آ ہی گیا

اللہ اللہ یہ مری ترک و طلب کی وسعتیں! (قطعہ) رفتہ رفتہ سامنے حسنِ تمام آ ہی گیا

اوّل اوّل ہر قدم پر تھیں ہزاروں منزلیں   آخر آخر اک مقامِ بے مقام آ ہی گیا

التفاتِ چشمِ ساقی کی سُبک تابی نہ پوچھ   میں یہ سمجھا جیسے مجھ تک دورِ جام آ ہی گیا

عشق کو تھا کب سے اپنی خشک دامانی کا رنج   ناگہاں آنکھوں کو اشکوں کا سلام آ ہی گیا

ہر نگہ پر بندشیں، ایک اک نفس کی پرسشیں   ہوشیار اے عشق وہ نازک مقام آ ہی گیا

اہلِ دُنیا اور کفرانِ زمانہ تا بکے
خود زمانہ بن کے تیغِ بے نیام آ ہی گیا

شوق نے ہر چند صد ہا تفرقے ڈالے مگر
زندگی کو راس دردِ ناتمام آ ہی گیا

صحبتِ رنداں سے واعظ کچھ نہ حاصل کر سکا
بہکا بہکا سا مگر طرزِ کلام آ ہی گیا

بے جگر سونا پڑا تھا مُدتوں سے میکدہ
پھر وہ دریا نوش رندِ تشنہ کام آ ہی گیا

(۸)

پرائے ہاتھوں جینے کی ہوس کیا   نشیمن ہی نہیں تو پھر قفس کیا

مکان و لامکاں سے بھی گذر جا   فضائے شوق میں پروازِ خس کیا

کرم صیّاد کے صد ہا ہیں پھر بھی   فراغِ خاطرِ اہلِ قفس کیا

محبّت سرفروشی جاں سپاری   محبّت میں خیالِ پیش و پس کیا

اجل خود زندگی سے کانپتی ہے   اجل کی زندگی پر دسترس کیا

زمانے پر قیامت بن کے چھا جا   بنا بیٹھا ہے طوفاں در نفس کیا

قفس سے ہے اگر بیزار بُلبُل   تو پھر یہ شغلِ تزئینِ قفس کیا

لہو آتا نہیں کھنچ کر مژہ تک

نہ آئے گی بہار اب کی برس کیا

(۹)

یک لحظہ خوشی کا جب انجام نظر آیا　　شبنم کو ہنسی آئی دل غنچوں کا بھر آیا

یہ کون تصوّر میں ہنگامِ سحر آیا　　محسوس ہوا، جیسے خود عرش اُتر آیا

خیر اس کو نظر آیا، شر اس کو نظر آیا　　آئینے میں خود عکسِ آئینہ نگر آیا

اُس بزم سے دل لے کر کیا آج اثر آیا　　ظالم جسے سمجھے تھے مظلوم نظر آیا

اُس جانِ تغافل نے پھر یاد کیا شاید　　پھر عہدِ محبت کا ہر نقش اُبھر آیا

گلشن کی تباہی پر کیوں رنج کرے کوئی　　الزام جو آنا تھا دیوانوں کے سر آیا

یہ محفلِ ہستی بھی کیا محفلِ ہستی ہے
جب کوئی اُٹھا پردہ میں خود ہی نظر آیا

(۱۰)

تیرا تصوّر شب ہمہ شب — خلوتِ غم بھی بزمِ طرب

دعویٰ شوق اور شکوہ بلب — شرم! دلِ آرام طلب

باتیں ہیں دو، مقصود ہے ایک — تیری طلب یا اپنی طلب

آ ہی گیا اک مستِ شباب — شیشہ بدست و نغمہ بلب

حسن مکملِ، جذب و گریز — عشقِ مسلسل، ترک و طلب

بیت گئی جو دل پہ نہ پوچھ — ہجر کی شب اور آخرِ شب

ترکِ طلب اور اطمینان — دیکھ تو میرا حسنِ طلب

ہائے وہ دردِ دل کہ جگرؔ

کچھ نہیں کھلتا جس کا سبب

(۱۱)

سینے میں اگر ہو دلِ بیدارِ محبّت | ہر سانس ہے پیغمبرِ اسرارِ محبّت

وہ بھی ہوئے جاتے ہیں طرفدارِ محبّت | اچھے نظر آتے نہیں آثارِ محبّت

ہشیار ہوا بے خود و سرشارِ محبّت | اظہارِ محبّت! ارے اظہارِ محبّت

تا دیر نہ ہو دل بھی خبردارِ محبّت | اک یہ بھی ہے اندازِ فسوں کارِ محبّت

تو ہینِ نگاہ کرمِ یار کہاں تک | دم لینے دے اے لذّتِ آزارِ محبّت

سب پھونک دئے خار و خسِ مذہب و ملّت | اللہ رے یک شعلۂ رخسارِ محبّت

کونین سے کیا اہلِ محبّت کو سروکار | کونین ہے خود غاشیہ بردارِ محبّت

جو عرش کی رفعت کو بھی اُس در پہ جُھکا دے | ایسا بھی کوئی جذبۂ سرشارِ محبّت

ہیں نیّرِ انہیں تاریک فضاؤں میں بھی اکثر | دیکھے ہیں برستے ہوئے انوارِ محبّت

ناصح کو ہے کیوں میری محبّت سے سروکار   چہرے سے تو کھلتے نہیں آثارِ محبت

میں اور یہ تمکینِ غمِ عشق ارے توبہ   تو، اور یہ احساسِ گراں بارِ محبّت!

اب عرضِ محبّت کی جگر کیوں نہیں جرأت

وہ سامنے ہیں، گرم ہے بازارِ محبّت

---

(۱۲)

غم ہے کیا زینۂ صفات و ذات　　غم نہیں ہے تو آرزو، نہ حیات

نغمۂ آرزو و رقصِ حیات　　مرحبا عاشقانِ خوش اوقات

تو محبّت کو لازوال بنا!　　زندگی کو اگر نہیں ہے ثبات

ہم نے دیکھے ہیں جاگتے ہوئے دِل　　ہم سے پُوچھو ستم کے احسانات

آرزو ہر نفس حیات و مرگ　　عاشقی بے نیازِ مرگ و حیات

باتوں باتوں میں آج تو ہر بزم　　کہہ گئے وہ ہر ایک دل کی بات

آپ جو کچھ کہیں بجا، لیکن　　آپ پر بھی ہیں چند الزامات

حُسن ہی حسن، جلوہ ہی جلوہ　　اللہ اللہ ہجومِ کیفیات

عشق وہ تشنہ کام ہے کہ جسے　　زہر کا گھونٹ بھی ہے آبِ حیات

اے کمالِ سخن کے دیوانے

"ماورائے سخن بھی ہے اِک بات"

(۱۳)

دُنیا کے ستم یاد، نہ اپنی ہی وفا یاد — اب مجھ کو نہیں کچھ بھی محبّت کے سوا یاد

ہیں شکوہ بلب تھا مجھے یہ بھی نہ رہا یاد — شاید کہ مرے بھولنے والے نے کیا یاد

چھیڑا تھا جسے پہلے پہل تیری نظر نے — اب تک ہے وہ اک نغمۂ بے ساز و صدا یاد

جب کوئی حسیں ہوتا ہے سرگرمِ نوازش — اُس وقت وہ کچھ اور بھی آتے ہیں سوا یاد

کیا جانئے کیا ہو گیا اربابِ جنوں کو — مرنے کی ادا یاد نہ جینے کی ادا یاد

قطعہ

مدت ہوئی اک حادثۂ عشق کو، لیکن — ابتک ہے ترے دل کے دھڑکنے کی صدا یاد

ہاں ہاں تجھے کیا کام مری شدّتِ غم سے — ہاں ہاں نہیں مجھ کو ترے دامن کی ہوا یاد

ہیں ترکِ رہ و رسمِ جنوں کر ہی چکا تھا — کیوں آگئی ایسے میں تری لغزشِ پا یاد

کیا لطف کہ میں اپنا پتہ آپ بتاؤں

کیجئے کوئی بھولی ہوئی خاص اپنی ادا یاد

(۱۳)

حسین دل، متبسّم نگاہ پیدا کر
پھر اک لطیف سی خاموش آہ پیدا کر

جسے ہوائے زمانہ کبھی بُجھا نہ سکے
قدم قدم پہ وہ اک شمعِ راہ پیدا کر

خلوصِ عشق و یقینِ حیات کے ہمراہ
جنونِ شوق و فسونِ نگاہ پیدا کر

رگوں میں بھر کے فروغِ جمالِ الّا اللہ
نظر میں شعلگیِ لا الٰہ پیدا کر!

یہی زمیں ترا مسکن، یہی ترا مدفن
اسی زمین سے تو مہر و ماہ پیدا کر

(۱۵)

شاہد و ساقی و بہار سے دُور — یعنی ہر کیفِ مستعار سے دُور

تخت سے، تاج و تاجدار سے دُور — دُور اس دَورِ فتنہ کار سے دُور

ہے خزاں اپنی ہر خزاں سے جُدا — ہے بہار اپنی ہر بہار سے دُور

ستم و جورِ آسماں سے الگ — کرم و لطفِ غمگسار سے دُور

قطعہ

خطرۂ موت اب، نہ فکرِ حیات — نشہ ہی نشہ ہے خمار سے دُور

پرتوِ حسنِ ذات سے نزدیک — سایۂ زلفِ تابدار سے دُور

اک حقیقت خیال سے برتر — اک جہاں چشم روزگار سے دُور

عشق ہے اُس مقام پر کہ جہاں
حُسن ہے نقصِ اعتبار سے دُور

(۱۶)

نغمہ ترا نفس نفس، جلوہ ترا نظر نظر
اے مرے شاہدِ حیات اور ابھی قریب تر

بن گئی مستقل عذاب، جانِ خرابِ شوق پر
خود مری کاوشِ نگاہ، خود مری فکرِ پردہ در

تیرا خلوصِ دلبری، جان نہ ڈال دے اگر
نالہ بھی میرا مضمحل، نغمہ بھی میرا بے اثر

معرفتِ جمال میں، کام نہ آئے بال و پر
عقل کہیں پہ گر پڑی، چھوٹ گئی کہیں نظر

با ہمہ ذوقِ آگہی، ہائے رے پستئ بشر
سارے جہاں کا جائزہ اپنے جہاں سے بے خبر

دیکھا ہے اک جہانِ خاص میں نے کبھی کبھی جگر
حُسن سے بھی بلند تر، عشق سے بھی لطیف تر

شورشِ درد الاماں، گردشِ دہر الحذر
بھٹکے ہوئے سے قافلے سہمی ہوئی سی رہگذر

آ مری جانِ انتظار، آ مرے آفتابِ شوق
تیرے بغیر زندگی کب سے ہے شامِ بے سحر

عرضِ نیازِ عشق کا چاہیے اور کیا صلہ
مَیں نے کہا بہ چشمِ نم اُس نے سُنا بہ چشمِ تر

لاکھ بیانِ دردِ دل اک وہ تبسمِ حزیں
لاکھ فسانہائے شوق اک وہ نگاہِ مختصر

مجھ سے کسی کو کام کیا، میرا کہیں قیام کیا — میرا سفر ہے در وطن، میرا وطن ہے در سفر
حُسن سے جو نہ ہو سکا، کر گئی حُسن کی اک آہ — عشق نے توڑ دی کماں، عقل نے ڈال دی سپر

لاکھ ستارے ہر طرف، ظلمتِ شب جہاں جہاں
ایک طلوعِ آفتاب، دشت و چمن سحر سحر

(۱۷)

محبّت میں جگرؔ گذرے ہیں ایسے بھی مقام اکثر
کہ خود لینا پڑا ہے اپنے دل سے انتقام اکثر

کہاں حُسنِ تمامِ یار و تکلیفِ کرم کوشی
بدل دیتی ہے دُنیا اک نگاہِ ناتمام اکثر

مری رِندی بھی کیا رِندی، مری مستی بھی کیا مستی
مری توبہ بھی بن جاتی ہے میخانہ بجام اکثر

محبّت نے اُسے آغوش میں بھی پالیا آخر
تصوّر ہی میں رہتا تھا جو اک محشر خرام اکثر

جگرؔ ایسا بھی دیکھا ہے کہ ہنگامِ سیہ مستی
نظر سے چھپ گئے ہیں ساقی و مینا و جام اکثر

(۱۸)

تری رحمت خطا بخش و خطا پوش مری جرأت خطا کار و خطا کوش

ہوا جاتا ہے دل پیماں فراموش کہاں ہے اے جنونِ خانہ بردوش

یہ کہہ کر ہو گیا دیوانہ خاموش سلامِ آخری اے جنّتِ ہوش

خبر لے اپنی اے غارت گرِ ہوش ہوا جاتا ہے تو بھی خود فراموش

نہ پہونچی آنچ دامن تک کسی کے بڑا احساں ترا اے سوزِ خاموش

بہ اعجازِ نگاہِ نازِ ساقی مری ہستی ہمہ مستی ہمہ ہوش

اسی کو بڑھ کے ہونا ہے قیامت سلامت باکرامت فتنۂ ہوش

ہمیں شکوے تھے کیا کیا اُن سے لیکن

ہمیں ثابت ہوئے احساں فراموش

(۱۹)

(مسلسل)

وہ احساسِ شوقِ جواں اوّل اوّل　　وہ اک عالمِ گلفشاں اوّل اوّل

وہ خود ساختہ اک طلسمِ تمنّا　　وہ تالیف و تصنیفِ جاں اوّل اوّل

وہ موہوم سا اک جہانِ محبّت　　وہ مبہم سی اک داستاں اوّل اوّل

تخیّل میں رنگینیاں رفتہ رفتہ　　تصوّر میں تصویرِ جاں اوّل اوّل

وہ اک کلفتِ شادماں تازہ تازہ　　وہ اک عشرتِ سرگراں اوّل اوّل

مجسّم وہ تعبیرِ خوابِ محبّت　　وہ نظّارۂ ناگہاں اوّل اوّل

وہ اک پیکرِ حُسنِ معصوم و سادہ　　وہ اک جلوۂ بے اماں اوّل اوّل

تکلّم میں بے ربط سا اک تسلسل　　خموشی میں حُسنِ بیاں اوّل اوّل

جگرؔ آہ انجام و آغازِ اُلفت

سکوت آخر آخر، فغاں اوّل اوّل

(۷۰)

اللہ رے اس گلشنِ ایجاد کا عالم
جو صید کا عالم، وہی صیاد کا عالم

اُف رنگِ رُخِ بانیِ بیداد کا عالم
جیسے کسی مظلوم کی فریاد کا عالم

پتھر سے دھڑکنے کی بھی آتی نہیں آواز
کیا جانئے کیا ہے دلِ ناشاد کا عالم

منصور تو سر دے کے سُبک ہو گیا لیکن
جلّاد سے پُوچھے کوئی جلّاد کا عالم

ہیں اور ترے ہجرِ مسلسل کی شکایت
تیرا ہی تو عالم ہے تری یاد کا عالم

کیا جانئے کیا ہے مری معراجِ مقامی
عالم تو ہے صرف اک مری اُفتاد کا عالم

اربابِ چمن سے نہیں، پُوچھو یہ چمن سے
کہتے ہیں کسے نکہتِ برباد کا عالم

کیوں آتشِ گُل میرے نشیمن کو جلائے
تنکوں میں ہے خود برقِ چمن زاد کا عالم

(۲۱)

حُسن کا فرِ شباب کا عالم | سر سے پا تک شراب کا عالم
عرق آلود چہرۂ تاباں | شبنم و آفتاب کا عالم
وہ مری عرضِ شوقِ بے حد پر | کچھ حیا، کچھ عتاب کا عالم
اللہ اللہ وہ امتزاجِ لطیف | شوخیوں میں حجاب کا عالم
ہمہ نور و سرور کی دُنیا | ہمہ حُسن و شباب کا عالم
وہ لبِ جوئبار و موسمِ گل | وہ شبِ ماہتاب کا عالم
زانوئے شوق پر وہ پچھلے پہر | نرگسِ نیم خواب کا عالم
دیر تک اختلاطِ ناز و نیاز | یک بیک اجتناب کا عالم!
لاکھ رنگیں بیانیوں پہ مری | ایک سادہ جواب کا عالم

غم کی ہر موج، موجِ طوفاں خیز   دل کا عالم، حباب کا عالم
دلِ مضطرب سمجھ سکے شاید   اک شکستہ رباب کا عالم

وہ سماں آج بھی ہے یاد جگر
ہاں مگر جیسے خواب کا عالم
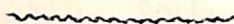
(۲۲)

جنوں کم، جستجو کم، تشنگی کم — نظر آئے نہ کیوں دریا بھی شبنم

بحمد اللہ تو ہے جس کا ہمدم — کہاں اُس قلب میں گنجائشِ غم

توجّہ بے نہایت اور نظر کم — خوشا یہ التفاتِ حُسنِ برہم

مری آنکھوں نے دیکھا ہے وہ عالم — کہ ہر عالم ہے لغزشہائے پیہم

خطا کیونکر نہ ہوتی عافیت سوز — کہ جنّت ہی نہ تھی معراجِ آدم

خوشا یہ نسبتِ حُسن و محبّت — جہاں بیٹھے نظر آئے ہمیں ہم

وہ اک حُسنِ سراپا اللہ اللہ — کہ جس کی ہر ادا عالم ہی عالم

کہاں پہلوئے خورشیدِ جہاں تاب — کہاں اک نازنیں دوشیزۂ شبنم

ے مسرّت، زندگی کا دوسرا نام

مسرّت کی تمنّا، مستقل غم

(۲۳)

رکھتے ہیں خضر سے، نہ غرض رہنما سے ہم
چلتے ہیں بچ کے دُور ہر اک نقشِ پا سے ہم

مانوس ہو چلے ہیں جو دل کی صدا سے ہم
شاید کہ جی اُٹھے تری آوازِ پا سے ہم

یارب نگاہِ شوق کو دے اور وسعتیں
گھبرا اُٹھے جمالِ جہت آشنا سے ہم

مخصوص کس کے واسطے ہے رحمتِ تمام
پوچھیں گے ایک دن یہ کسی پارسا سے ہم

او مستِ نازِ حُسن تجھے کچھ خبر بھی ہے
تجھ پر نثار ہوتے ہیں کس کس ادا سے ہم

یہ کون چھا گیا ہے دل و دیدہ پر کہ آج
اپنی نظر میں آپ ہیں ناآشنا سے ہم

(۲۴)

یہ ذرّے جن کو ہم خاکِ رہِ منزل سمجھتے ہیں

زبانِ حال رکھتے ہیں، زبانِ دل سمجھتے ہیں

جسے سب لوگ حُسن و عشق کی منزل سمجھتے ہیں

بلند اس سے بھی ہم اپنا مقامِ دل سمجھتے ہیں

حقیقت میں جو رازِ دُوریِ منزل سمجھتے ہیں

اُنہیں کو ہم سلوکِ عشق میں کامل سمجھتے ہیں

ہمیں کیوں وہ جفائے خاص کے قابل سمجھتے ہیں

یہ رازِ دل ہے، اس کو محرمانِ دل سمجھتے ہیں

اسی اک جُرم پر اغیار میں برپا قیامت ہے

کہ ہم بیدار ہیں اور اپنا مستقبل سمجھتے ہیں

نگاہوں میں کچھ ایسے بس گئے ہیں حُسن کے جلوے

کوئی محفل ہو، لیکن ہم تری محفل سمجھتے ہیں

کوئی مانے نہ مانے اِس کو، لیکن یہ حقیقت ہے

ہم اپنی زندگی میں غیب کو شامل سمجھتے ہیں

یہ نرم و ناتواں موجیں خودی کا راز کیا جانیں

قدم لیتے ہیں طوفاں، عظمتِ ساحل سمجھتے ہیں

حکومت کے مظالم جب سے اِن آنکھوں نے دیکھے ہیں

جگر ہم بمبئی کو کوچۂ قاتل سمجھتے ہیں!

(۲۵)

یہ تو نہیں کہ عرضِ غم درخورِ اعتنا نہیں — حُسن کو لیکن اے جگرؔ فرصتِ ماسوا نہیں

نالۂ جاں فروز با نغمۂ غم فزا نہیں — اے دلِ فتنہ آفریں تو ہے اگر تو کیا نہیں

پیشِ نظر ہے حُسنِ دوست حُسن کے ماسوا نہیں — عشق میں مبتلا ہوں میں شرک میں مبتلا نہیں

غیر نے کچھ اگر کہا رنج کرے نری بلا — تو ہی جو باوفا نہیں کوئی بھی باوفا نہیں

بیٹھے ہیں بزمِ دوست میں گمشدگانِ حسنِ دوست — عشق ہے اور طلب نہیں نغمہ ہے اور صدا نہیں

پینے سے کام ہے ہمیں میکدۂ حیات میں — ظرف جُدا جُدا سہی اصل جُدا جُدا نہیں

پھول وہی، چمن وہی، فرق نظر نظر کا ہے — عہدِ بہار میں تھا کیا، دورِ خزاں میں کیا نہیں

پھر یہ جُدائیاں ہیں کیوں پھر یہ دُہائیاں ہیں کیا — عشق سے تو الگ نہیں حُسن سے میں جُدا نہیں

اے مرے مقصدِ حیات، گوشۂ چشم التفات — ایک نگہ تو ہے بہت، نیم نگہ میں کیا نہیں

اُف یہ کرشمہ کاریاں، ہائے یہ ربطِ حُسن و عشق — مجھ پہ کوئی نظر نہیں، تیری کوئی خطا نہیں

خشک نہ لب نہ آنکھ تر، واہ رے حضرتِ جگرؔ!

جیسے کہ دُور کا بھی اب عشق سے واسطہ نہیں

(٢٦)

مقاماتِ اربابِ جاں اور بھی ہیں ‏ مکاں اور بھی، لامکاں اور بھی ہیں

مکمل نہیں ہے جنونِ تجسّس ‏ مسلسل جہاں در جہاں اور بھی ہیں

یہیں تک نہیں عشق کی سیرگاہیں ‏ مہ و انجم و کہکشاں اور بھی ہیں

محبّت کی منزل ہی شاید نہیں ہے ‏ کہ جب دیکھیئے امتحان اور بھی ہیں

محبّت نہیں صرف مقصودِ انساں ‏ محبت میں کارِ جہاں اور بھی ہیں

قفس توڑ کر مطمئن ہو نہ بلبل ‏ قفس صورتِ آشیاں اور بھی ہیں!

بہت دل کے حالات کہنے کے قابل ‏ ورائے نگاہ و زباں اور بھی ہیں

نہیں منحصر کچھ مے و میکدہ تک ‏ مری تشنہ سامانیاں اور بھی ہیں

خوشا درسِ غیرت، نہ ہے عشق تنہا ‏ وہاں میں نہیں ہوں، جہاں اور بھی ہیں

صبا خاکِ دل سے بچا اپنا دامن ‏ ابھی اس میں چنگاریاں اور بھی ہیں

انہیں جب سے ہے اعتمادِ محبّت

وہ مجھ سے جگر بدگماں اور بھی ہیں

(۲۷)

دل میں کسی کے راہ کئے جا رہا ہوں میں
کتنا حسیں گناہ کئے جا رہا ہوں میں

دنیائے دل تباہ کئے جا رہا ہوں میں
صرفِ نگاہ و آہ کئے جا رہا ہوں میں

فردِ عمل سیاہ کئے جا رہا ہوں میں
رحمت کو بے پناہ کئے جا رہا ہوں میں

ایسی بھی اک نگاہ کئے جا رہا ہوں میں
ذرّوں کو مہر و ماہ کئے جا رہا ہوں میں

مجھ سے لگے ہیں عشق کی عظمت کو چار چاند
خود حُسن کو گواہ کئے جا رہا ہوں میں

دفتر ہے ایک معنیِ بے لفظ و صوت کا
سادہ سی جو نگاہ کئے جا رہا ہوں میں

آگے قدم بڑھائیں جنہیں سُوجھتا نہیں
روشن چراغِ راہ کئے جا رہا ہوں میں

معصومئ جمال کو بھی جن پہ رشک ہے
ایسے بھی کچھ گناہ کئے جا رہا ہوں میں

تنقیدِ حُسن مصلحتِ خاصِ عشق ہے
یہ جرم گاہ گاہ کئے جا رہا ہوں میں

اُٹھتی نہیں ہے آنکھ مگر اُس کے روبرو
نادیدہ اک نگاہ کئے جا رہا ہوں میں

گلشن پرست ہوں مجھے گُل ہی نہیں عزیز کانٹوں سے بھی نباہ کئے جا رہا ہوں میں

یُوں زندگی گذار رہا ہوں ترے بغیر جیسے کوئی گناہ کئے جا رہا ہوں میں

مجھ سے ادا ہوا ہے جگرؔ جستجو کا حق

ہر ذرّے کو گواہ کئے جا رہا ہوں میں

(۲۸)

بے کیف دل ہے اور جئے جا رہا ہوں میں　　خالی ہے شیشہ اور پئے جا رہا ہوں میں

پیہم جو آہ آہ کئے جا رہا ہوں میں　　دولت ہے غم زکوٰۃ دئے جا رہا ہوں میں

مجبوری کمالِ محبت تو دیکھنا　　جینا نہیں قبول جئے جا رہا ہوں میں

وہ دل کہاں ہے اب کہ جسے پیار کیجیے　　مجبوریاں ہیں ساتھ دئے جا رہا ہوں میں

رخصت ہوئی شباب کے ہمراہ زندگی　　کہنے کی بات ہے کہ جئے جا رہا ہوں میں

پہلے شراب زیست تھی، اب زیست ہے شراب

کوئی پلا رہا ہے، پئے جا رہا ہوں میں

(۲۹)

جو مسرّتوں میں خلش نہیں، جو اذیّتوں میں مزا نہیں

ترے حُسن کا بھی قصور ہے مرے عشق ہی کی خطا نہیں

مرے جذبِ عشق پہ رحمتیں، مجھے بے بسی کا گلا نہیں

ترے جبرِ حُسن کی خیر ہو، مرے اختیار میں کیا نہیں

مرا ذوق بھی مرا شوق بھی ہے بلند سطحِ عوام سے

ترا ہجر بھی، ترا وصل بھی، مرے دردِ دل کی دوا نہیں

جسے میں بھی خود نہ بتا سکا، مرا رازِ دل ہے وہ رازِ دل

جسے غیر دوست سمجھ سکے، مرے ساز میں وہ صدا نہیں

مرا نالہ ہوش رُبا ہو گیا، مرا نغمہ رُوح فزا ہو گیوں

کہ چمن میں پھول تو ہیں وہی، مگر ان میں بوئے وفا نہیں

یہ طریقِ جہد ہے خوب تر، مگر آہ واعظِ بے خبر

اُسے سازگار ہو زہد کیا، جسے معصیت بھی روا نہیں

مرے درد میں یہ خلش کہاں، مرے سوز میں یہ تپش کہاں

کسی اور ہی کی پکار ہے، مری زندگی کی صدا نہیں

وہ ہزار دشمنِ جاں سہی، مجھے غیر پھر بھی عزیز ہے

جسے خاکِ پا تری چھو گئی، وہ بُرا بھی ہو تو بُرا نہیں

وہی ربطِ عشق و جمال ہے، ترا اور کچھ جو خیال ہے

یہ سمجھ تجھی میں ہے کچھ کمی، یہ نہ کہہ کہ جنسِ وفا نہیں

وہی میں ہوں اور وہی انجمن، مگر آج ہے مرا حال کیا

یہ گمان ہے کہ حقیقتاً کوئی اور تیرے سوا نہیں

مرے شعر میں ہیں نزاکتیں، مری نظم میں ہیں لطافتیں

مری فکر میں کہیں اے جگرؔ، ادبِ کثیف کی جا نہیں

(۳۰)

اُس رُخ پہ اثرِ دحامِ نظر دیکھتا ہوں میں
کانٹوں کی گود میں گُلِ تر دیکھتا ہوں میں

سعیِ مآلِ فکر و نظر دیکھتا ہوں میں
منزل رواں دواں ہے جدھر دیکھتا ہوں میں

تاثیرِ التفاتِ نظر دیکھتا ہوں میں
کونین اپنے زیرِ اثر دیکھتا ہوں میں

خود جس میں آرزوئے شکستِ غرور ہے
ایسی بھی آج ایک نظر دیکھتا ہوں میں

رعبِ جمال و جذبِ محبت تو دیکھنا
اٹھتی نہیں نگاہ، مگر دیکھتا ہوں میں

تنہا نہیں ہے عشق ہی رُسوائے جستجو!
خود حُسن کو بھی گرمِ سفر دیکھتا ہوں میں

اللہ رے کمالِ خودی کی یہ وسعتیں
میرا ہی سامنا ہے جدھر دیکھتا ہوں میں

اے عشق! شاد باش کہ آج اُن کو بار بار
مصروفِ احتیاطِ نظر دیکھتا ہوں میں

محوِ خرامِ ناز ہیں صحنِ چمن میں وہ
گُستاخیٔ نسیمِ سحر دیکھتا ہوں میں

میرا مقامِ عشق مقامِ فنا نہیں
دُنیائے زندگی ہے جدھر دیکھتا ہوں میں

شاید اُنہیں بھی اُس کی خبر ہو نہ اے جگر
در پردہ منظر جو نظر دیکھتا ہوں میں

(۳۱)

جُز عشق معتبر یہ کسی کو خبر نہیں — ایسا بھی حُسن ہے جو بقیدِ نظر نہیں

سنجیدگی ہزار ہو، غم سے مفر نہیں — دریا اُسی میں بند ہے جو آنکھ تر نہیں

دُنیا کو دیکھ دیدۂ روشن نگاہ سے — فردوسِ زندگی ہے وبالِ نظر نہیں

جو ہر نفس کے ساتھ نہ لائے پیامِ دوست — ہرگز وہ میری شام، وہ میری سحر نہیں

یہ شرمگیں نگاہ، یہ انکارِ مضمحل — پھر کیا ہے، اعترافِ محبّت اگر نہیں

وہ کونسا ہے جلوہ، مکرّر کہیں جسے — وہ کونسی نظر ہے جو پہلی نظر نہیں

طولِ غمِ حیات سے گھبرا نہ اے جگر — ایسی بھی کوئی شام ہے جسکی سحر نہیں

بھوپال اگرچہ خلد بدامن ہے اے جگر
دل کیا شگفتہ ہو کہ نسیمِ[1] جگر نہیں

[1] تلمیح

(۳۲)

محبّت میں یہ کیا مقام آ رہے ہیں
کہ منزل پہ ہیں اور چلے جا رہے ہیں

یہ کہہ کہہ کے ہم دل کو بہلا رہے ہیں
وہ اب چل چکے ہیں، وہ اب آ رہے ہیں

وہ از خود ہی نادم ہوئے جا رہے ہیں
خدا جانے کیا کیا خیال آ رہے ہیں

ہمارے ہی دل سے مزے اُن کے پوچھو
وہ دھوکے جو دانستہ ہم کھا رہے ہیں

جفا کرنے والوں کو کیا ہو گیا ہے
وفا کر کے بھی ہم تو شرما رہے ہیں

وہ عالم ہے اب یار و اغیار کیسے
ہمیں اپنے دشمن ہوئے جا رہے ہیں

مزاجِ گرامی کی ہو خیر یارب
کئی دن سے اکثر وہ یاد آ رہے ہیں

(۳۴)

کہاں کے لالہ و گل، کیا بہارِ توبہ شکن — کھلے ہوئے ہیں دلوں کی جراحتوں کے چمن

یہ کس غضب کی محبت نے ڈال دی اُلجھن — نہ ضبطِ شوق کا یارا، نہ تابِ عرضِ سخن!

خلوصِ شوق، نہ جوشِ عمل، نہ دردِ وطن — یہ زندگی ہے خدایا کہ زندگی کا کفن!

جمال اُس کا چھپائے گی کیا بہارِ چمن — گلوں سے دب نہ سکی جس کی بوئے پیراہن!

وطن ہی جب نہیں اپنا تو پھر کہاں کا وطن — چمن اُجاڑ رہا ہوں مگر برائے چمن!

غضب ہے قہر ہے انسان کی یہ بوالعجبی — خود اپنا دوست بہت کم، زیادہ تر دشمن!

یہ مرحلہ بھی مری حیرتوں نے دیکھ لیا — بہار میرے لئے اور میں تہی دامن!

مرا شعورِ محبت ہے کس لئے ہمہ گوش — اگر نہیں مری جانب کسی کا روئے سخن!

ابھی ہے دل کو مقامِ سپردگی سے گریز — اک اور بھی سہی گیسوئے عنبریں میں شکن!

بہ ہوش باش کہ وہ انقلاب آپہونچا — میں سُن رہا ہوں دلِ سنگ و خشت کی دھڑکن!

خرد، حقیقتِ چالاک و چست و سُست خرام　　جنوں صداقتِ بیباک و مصلحت دشمن

حضورِ دوست یہی جرمِ زندگی نکلا　　جنابِ شیخ کو تھا زعمِ پاکیٔ دامن

جنوں کی بے سر و سامانیوں پہ رنج نہ کر　　اگر جنوں ہے سلامت ہزار ہا دامن

جہانِ حُسن کو بھی جس نے کر دیا بیدار　　خوشا وہ سینۂ اہلِ فراق کی دھڑکن

ہر ایک لحظہ ہے درپیش کارزارِ حیات　　سکوں تلاش نہ کر اے دلِ سکوں دشمن

وہی ہے رُوحِ محبت وہی ہے جسمِ وفا　　بدلتا رہتا ہے لیکن مذاقِ پیراہن

مقامِ عشق کی نیرنگیاں نہ پُوچھ جگر

کمالِ آگہی و سخت آگہی دشمن

(۳۴)

اللہ اگر توفیق نہ دے انسان کے بس کا کام نہیں

فیضانِ محبت عام سہی، عرفانِ محبت عام نہیں

یہ تو نے کہا کیا اے ناداں، فیاضیِ قدرت عام نہیں

تو فکر و نظر تو پیدا کر، کیا چیز ہے جو انعام نہیں

یارب یہ مقامِ عشق ہے کیا؟ گو دیدہ و دل ناکام نہیں

تسکین ہے اور تسکین نہیں، آرام ہے اور آرام نہیں

کیوں مستِ شرابِ عیش و طرب تکلیفِ توجہ فرمائیں

آوازِ شکستِ دل ہی تو ہے، آوازِ شکستِ جام نہیں

آنا ہے جو بزمِ جاناں میں، پندارِ خودی کو توڑ کے آ

اے ہوش و خرد کے دیوانے یاں ہوش و خرد کا کام نہیں

زاہد نے کچھ اس انداز سے پی، ساقی کی نگاہیں پڑنے لگیں

میکش یہی اب تک سمجھے تھے، شائستہ دورِ جام نہیں

عشق، اور گوارا خود کر لے بے شرط شکستِ فاش اپنی

دل کی بھی کچھ اُن کے سازش ہے، تنہا یہ نظر کا کام نہیں

سب جس کو اسیری کہتے ہیں، وہ تو ہے اسیری ہی لیکن

وہ کون سی آزادی ہے یہاں، جو آپ خود اپنا دام نہیں
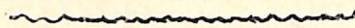
(۳۵)

اب لفظِ بیاں سب ختم ہوئے، اب دیدہ و دل کا کام نہیں

اب عشق ہے خود پیغام اپنا، اب عشق کا کچھ پیغام نہیں

اللہ کے علم و حکمت کے محدود اگر اکرام نہیں!

ہر سانس کے آنے جانے میں کیا کوئی نیا پیغام نہیں

ہر خلدِ تمنّا پیشِ نظر، ہر جنّتِ نظّارہ حاصل

پھر بھی ہے وہ کیا شے سینے میں ممکن ہی جسے آرام نہیں

یہ حُسن ہے کیا؟ یہ عشق ہے کیا؟ کِس کو ہے خبر اسکی لیکن

بے جام ظہورِ بادہ نہیں، بے بادہ فروغِ جام نہیں

زاہد ترے ان سجدوں کے عوض، سب کچھ ہو مبارک تجھکو مگر

وہ سجدہ یہاں ہے کُفرِ جبیں، جو سجدہ کہ خود انعام نہیں

دُنیا یہ دُکھی ہے پھر بھی مگر، تھک کر ہی سہی، سو جاتی ہے

تیرے ہی مقدر میں اے دل، کیوں چین نہیں آرام نہیں

اِک شاہدِ معنی و صورت کے ملنے کی تمنّا سب کو ہے

ہم اُس کے نہ ملنے پر ہیں فدا، لیکن یہ مذاقِ عام نہیں

پینے کو تو سب پیتے ہیں جگرؔ، میخانۂ فطرت میں لیکن!

محرمِ نگاہ ساقی ہے، وہ رند جو دُرد آشام نہیں!

(۳۶)
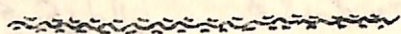
جب تک انساں پاک طینت ہی نہیں علم و حکمت، علم و حکمت ہی نہیں

وہ محبت، وہ عداوت ہی نہیں زندگی میں اب صداقت ہی نہیں

سینۂ آہن بھی تھا جس سے گداز اب دلوں میں وہ حرارت ہی نہیں

آدمی کے پاس سب کچھ ہے مگر ایک تنہا آدمیّت ہی نہیں

بھچکے رہ جائے وہ غنچہ ہی کہاں گھُٹ کے رہ جائے وہ نکہت ہی نہیں

حُسن کو سمجھا ہے کیا، اے بوالہوس حسنِ معنیٰ بھی ہے، صورت ہی نہیں

صرف نقّالی ہے مغرب کی جگر
شعر میں جب مشرقیّت ہی نہیں

(۳۷)

بے ربطِ حسن و عشق یہ کیف و اثر کہاں
تھی زندگی عزیز، مگر اس قدر کہاں

تیرے بغیر رونقِ دیوار و در کہاں
شام و سحر کا نام ہے شام و سحر کہاں

کیا جانیے خیال کہاں ہے نظر کہاں
تیری خبر کے بعد پھر اپنی خبر کہاں

ہر جلوۂ جمال ہے برقِ گریز پا
اے دل یہاں تجلّیِ بارِ دگر کہاں

مانا کہ محتسب بھی بڑا باشعور ہے
لیکن اُسے نزاکتِ غم کی خبر کہاں

مِل کر ہجومِ جلوہ میں خود جلوہ بن گئی
پہونچا ہے کس جگہ سے مقامِ نظر کہاں

آج اس کی میہمان ہے، کل اُس کی میہماں
اس خانماں خراب محبت کا گھر کہاں

کہنے کو اہلِ علم کی کوئی کمی نہیں
لیکن خود اپنی فکر، خود اپنی نظر کہاں

ترکِ تعلّقات کو مدت گذر چکی
ظالم ترے خیال سے پھر بھی مفر کہاں

ہر اعتبارِ دوست پہ صدقے ہزار جاں
لیکن وہ کیف وعدۂ نامعتبر کہاں

عرصہ ہوا کہ رسمِ محبت بدل گئی　　دامن سے وہ معاملۂ چشمِ تر کہاں

ہر گام پر ہے منزلِ نو جستجو طلب!　　جاتا ہے سر اٹھائے ہوئے بیخبر کہاں

صد عشرتِ نگاہِ مسلسل خوشا نصیب　　لیکن لطافت نگۂ مختصر کہاں

ہر چند کائناتِ دو عالم میں اے جگر

انساں ہی ایک چیز ہے، انساں مگر کہاں
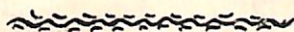
(۳۸)

عشق کی بربادیوں کو رائیگاں سمجھا تھا میں
بستیاں نکلیں جنہیں ویرانیاں سمجھا تھا میں

بے حجابی کو حجابِ درمیاں سمجھا تھا میں
سامنے کی بات تھی، لیکن کہاں سمجھا تھا میں

ہر نگہ کو طبعِ نازک پر گراں سمجھا تھا میں
وہ بھی کیا دن تھے جب اسکو بدگماں سمجھا تھا میں

شاد باش و زندہ باش، اے عشقِ خوش سودائے من
تجھ سے پہلے اپنی عظمت بھی کہاں سمجھا تھا میں

کیا خبر تھی خود وہ نکلیں گے برابر کے شریک
دل کی ہر دھڑکن کو اپنی داستاں سمجھا تھا میں

یاد ایّامے کہ جب ذوقِ طلب کامل نہ تھا
ہر غبارِ کارواں کو کارواں سمجھا تھا میں

آدمی کو آدمی سے بُعد، وہ بھی کس قدر
زندگی کو زندگی کا رازداں سمجھا تھا میں

کیا بتاؤں کس قدر زنجیرِ پا ثابت ہوئے
چند تنکے جن کو اپنا آشیاں سمجھا تھا میں

زندگی نکلی مسلسل امتحاں در امتحاں
زندگی کو داستاں ہی داستاں سمجھا تھا میں

ہر نفس کو جب حیاتِ جاوداں سمجھا تھا میں
اُس گھڑی کی شرم رکھ لے اے نگاہِ نازِ دوست

آج تک جس کو حدیثِ دیگراں سمجھا تھا میں
میری ہی رودادِ ہستی تھی مرے ہی سامنے

پردہ اُٹھا تو وہی صُورت نظر آئی جگر
مُدتوں رُوح القدس کو ہم زباں سمجھا تھا میں

(۳۹)
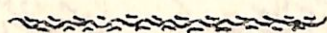
سبھی اندازِ حُسن پیارے ہیں ہم مگر سادگی کے مارے ہیں

اُس کی راتوں کا انتقام نہ پُوچھ جس نے ہنس ہنس کے دن گذارے ہیں

اے سہاروں کی زندگی والو! کتنے انسان بے سہارے ہیں

لالہ و گُل سے تجھکو کیا نِسبت نامکمل سے استعارے ہیں

ہم تو اب ڈوب کر ہی اُبھریں گے وہ رہیں شاد جو کنارے ہیں

شبِ فرقت بھی جگمگا اُٹھی اشکِ غم ہیں کہ ماہ پارے ہیں

آتشِ عشق وہ جہنم ہے جس میں فردوس کے نظارے ہیں

وہ ہمیں ہیں کہ جن کے ہاتھوں نے گیسوئے زندگی سنوارے ہیں

حُسن کی بے نیازیوں پہ نہ جا

بے اشارے بھی کچھ اشارے ہیں

(۴۰)

یہ صحن وروش، یہ لالہ وگل ہونے دو جو ویراں ہوتے ہیں

تخریبِ جنوں کے پردے میں تعمیر کے ساماں ہوتے ہیں

منڈلائے ہوئے جب ہر جانب طوفاں ہی طوفاں اٹھتے ہیں

دیوانے کچھ آگے بڑھتے ہیں اور دست و گریباں ہوتے ہیں

اس جہد و طلب کی دُنیا میں کیا کارِ نمایاں ہوتے ہیں

ہم صرف شکایت کرتے ہیں وہ صرف پشیماں ہوتے ہیں

بیدار عزائم ہوتے ہیں۔ اسرار نمایاں ہوتے ہیں

جتنے وہ ستم فرماتے ہیں، سب عشق پہ احساں ہوتے ہیں

رندوں نے جو چھیڑا زاہد کو ساقی نے کہا کس طنز سے آج

اوروں کی وہ عظمت کیا جانیں، کم ظرف جو انساں ہوتے ہیں

تو خوش ہے کہ تجکو حاصل ہیں میں خوش کہ مرے حصّے میں نہیں

وہ کام جو آساں ہوتے ہیں، وہ جلوے جو ارزاں ہوتے ہیں

آسودۂ ساحل تُو ہے مگر، شاید یہ تجھے معلُوم نہیں

ساحل سے بھی موجیں اُٹھتی ہیں، خاموش بھی طوُفاں ہوتے ہیں

یہ خون جو ہے مظلوموں کا، ضائع تو نہ جائے گا لیکن

کتنے وہ مبارک قطرے ہیں جو صرفِ بہاراں ہوتے ہیں

جو حق کی خاطر جیتے ہیں مرنے سے کہیں ڈرتے ہیں جگر

جب وقتِ شہادت آتا ہے، دل سینوں میں رقصاں ہوتے ہیں

(۴۱)

غم معتبر نہیں ہے، مکمل خوشی نہیں　　کیا وقت ہے کہ لطف محبّت میں بھی نہیں

یہ تو نہیں کہ مجکو سرِ مے کشی نہیں　　لیکن ابھی نہیں، مرے ساقی ابھی نہیں

تسخیر مہر و ماہ مبارک تجھے مگر　　دل میں نہیں اگر، تو کہیں روشنی نہیں

واعظ اب اور کیا کہوں، لیکن خطا معاف　　جو تیرے سامنے ہے حقیقت وہی نہیں

کیا جانئے یہ کونسا عالم ہے اے جگر
دل مضطرب ہے اور کوئی بات بھی نہیں

(۴۲)

کوئی یہ کہہ دے گلشن گلشن　　لاکھ بلائیں، ایک نشیمن

کامل رہبر، قاتل رہزن　　دل سا دوست، نہ دل سا دشمن

پھول کھلے ہیں گلشن گلشن　　لیکن اپنا اپنا دامن

عشق ہے پیارے کھیل نہیں ہے　　عشق ہے کارِ شیشہ و آہن

خیر مزاجِ حسن کی یا رب　　تیز بہت ہے دل کی دھڑکن

آ، کہ نجانے تجھ بن کب سے　　روح ہے لاشہ، جسم ہے مدفن

آج نجانے راز یہ کیا ہے　　ہجر کی رات اور اتنی روشن

عمریں بیتیں، صدیاں گذریں　　ہے وہی اب تک عقل کا بچپن

تجھ سا حسیں اور خونِ محبّت　　وہم ہے شاید سرخیِ دامن

برقِ حوادث، اللہ اللہ!　　جھوم رہی ہے شاخِ نشیمن

تُو نے سُلجھ کر گیسوئے جاناں اور بڑھا دی شوق کی اُلجھن

رحمت ہوگی طالبِ عصیاں رشک کرے گی پاکیِ دامن

دل کہ مجسّم آئینہ ساماں اور وہ ظالم آئینہ دشمن

بیٹھے ہم ہر بزم میں لیکن جھاڑ کے اُٹھّے اپنا دامن

ہستیِ شاعر اللہ اللہ! (قطعہ) حُسن کی منزل عشق کا مسکن

رنگیں فطرت، سادہ طبیعت فرش نشیں اور عرش نشیمن

کام ادھورا اور آزادی (قطعہ) نام بڑے اور تھوڑے درشن

شمع ہے، لیکن دُھندلی دُھندلی سایہ ہے، لیکن روشن روشن

کانٹوں کا بھی حق ہے کچھ آخر کون چھُڑائے اپنا دامن

چلتی پھرتی چھاؤں ہے پیارے

کس کا صحرا، کیسا گلشن

(۴۳)

ہم کو مٹا سکے، یہ زمانے میں دم نہیں
ہم سے زمانہ خود ہے، زمانے سے ہم نہیں

بے فائدہ الم نہیں، بیکار غم نہیں
توفیق دے خدا تو یہ نعمت بھی کم نہیں

میری زباں پہ شکوۂ اہلِ ستم نہیں
مجھکو جگا دیا، یہی احساں کم نہیں

یارب، ہجومِ درد کو دے اور وسعتیں
دامن تو کیا ابھی مری آنکھیں بھی نم نہیں

شکوہ تو ایک چھیڑ ہے، لیکن حقیقتہً
تیرا ستم بھی تیری عنایت سے کم نہیں

اب عشق اُس مقام پہ ہے جستجو نورد
سایہ نہیں جہاں، کوئی نقشِ قدم نہیں

ملتا ہے کیوں مزہ ستمِ روزگار میں
تیرا کرم بھی خود جو شریکِ ستم نہیں

زاہد کچھ اور ہو نہ ہو مے خانے میں مگر
کیا کم یہ ہے کہ فتنۂ دیر و حرم نہیں

مرگِ جگر پہ کیوں تری آنکھیں ہیں اشک ریز
اک سانحہ سہی، مگر اتنا اہم نہیں

(۴۴)

عشقِ لامحدود جب تک رہنما ہوتا نہیں
زندگی سے زندگی کا حق ادا ہوتا نہیں

بیکراں ہوتا نہیں، بے انتہا ہوتا نہیں
قطرہ جبتک بڑھ کے قلزم آشنا ہوتا نہیں

اس سے بڑھ کر دوست کوئی دوسرا ہوتا نہیں
سب جدا ہو جائیں لیکن غم جدا ہوتا نہیں

زندگی اک حادثہ ہے اور کیسا حادثہ
موت سے بھی ختم جسکا سلسلہ ہوتا نہیں

کون یہ ناصح کو سمجھائے بطرزِ دل نشیں
عشق صادق ہو تو غم بھی بے مزا ہوتا نہیں

درد سے معمور ہوتی جا رہی ہے کائنات
اک دلِ انساں مگر درد آشنا ہوتا نہیں

میری عرضِ غم پہ وہ کہنا کسی کا ہائے ہائے
شکوۂ غم، شیوۂ اہلِ وفا ہوتا نہیں

اُس مقامِ قُرب تک اب عشق پہنچا ہے جہاں
دیدہ و دل کا بھی اکثر واسطا ہوتا نہیں

ہر قدم کے ساتھ منزل، لیکن اسکا کیا علاج
عشق ہی کم بخت منزل آشنا ہوتا نہیں

اللہ اللہ یہ کمالِ ارتباطِ حُسن و عشق
فاصلے ہوں لاکھ دل سے دل جُدا ہوتا نہیں

کیا قیامت ہے کہ اس دورِ ترقی میں جگر
آدمی سے آدمی کا حق ادا ہوتا نہیں

(۴۵)

جو طوفانوں میں پلتے جا رہے ہیں — وہی دنیا بدلتے جا رہے ہیں

نکھرتا آ رہا ہے رنگِ گلشن — خس و خاشاک جلتے جا رہے ہیں

وہیں میں خاک اُڑتی دیکھتا ہوں — جہاں چشمے اُبلتے جا رہے ہیں

چراغِ دیر و کعبہ، اللہ اللہ — ہوا کی زد پہ جلتے جا رہے ہیں

شباب و حُسن میں بحث آ پڑی ہے

نئے پہلو نکلتے جا رہے ہیں

(۴۶)

عمر بھر روح کی اور جسم کی یک جائی ہو — کیا قیامت ہے کہ پھر بھی نہ شناسائی ہو

کوئی اتنا بھی نہ مصروفِ خود آرائی ہو — کہ تماشا رہے باقی، نہ تماشائی ہو

انجمن ہو، نہ سرِ انجمن آرائی ہو — میں ہوں اور صرف مرا عالمِ تنہائی ہو

مستیٔ حسن غمِ عشق پہ یوں چھائی ہو — دل سے جو موجِ غم اُٹھے تری انگڑائی ہو

اے غمِ دوست ترا صبر مجھی پر ٹوٹے — بے ترے نیند بھی آنکھوں میں اگر آئی ہو

وہ محبت ہی نہیں ہے وہ قیامت ہی نہیں — جو ترے پائے نگاریں کی نہ ٹھکرائی ہو

ہو گئی دل کو تری یاد سے اک نسبتِ خاص

اب تو شاید ہی میسّر کبھی تنہائی ہو

(۴۷)

داغِ دل کیوں کوئی مجروح پذیرائی ہو ‏ گُل ویرانہ بنے، لالۂ صحرائی ہو

دل اُلٹ جائے کہ دم پر مرے بن آئی ہو ‏ کیوں تری یاد شریکِ غمِ تنہائی ہو

پھر وُہی رُت، وہی ہم تم، وہی تنہائی ہو ‏ پھر ہر اک چوٹ محبّت کی اُبھر آئی ہو

نالہ یُوں کیجے، یہ اعجازِ شکیبائی ہو ‏ جیسے بے ساختہ ہونٹوں پہ ہنسی آئی ہو

حُسن و بے چارگیِ حُسن!!! الٰہی توبہ! ‏ میں تو مر جاؤں جو یوں عشق کی بن آئی ہو

عرصۂ حشر کہاں، جلوہ گہِ دوست کہاں ‏ وہ بھی میرا ہی نہ اک گوشۂ تنہائی ہو

بھُول جاؤں کہ مرا فرضِ محبت کیا ہے ‏ اس طرح تو نہ مری حوصلہ افزائی ہو

گر کے نظروں سے تری اُسکا ٹھکانا ہی کہاں ‏ جس نے ظالم ترے دل میں بھی جگہ پائی ہو

ہائے اُس حصۂ گلشن کا مقدر ہمدم ‏ نہ خزاں آئی ہو جس میں نہ بہار آئی ہو

یُوں بھی ہو کاش غمِ عشق کی تاثیر جگرؔ

میں تمنّا نہ کروں اور وہ تمنّائی ہو

(۴۸)

ممکن نہیں کہ جذبۂ دل کارگر نہ ہو — یہ اور بات ہے تمہیں ابتک خبر نہ ہو

توہینِ عشق، دیکھ نہ ہو اے جگر نہ ہو — ہو جائے دل کا خون مگر آنکھ تر نہ ہو

دریائے حسن و کارِ غمِ عشق ناصحا — یہ کیا کہا "ترا سرِ دامن بھی تر نہ ہو"

لازم خودی کا ہوش بھی ہے بیخودی کیساتھ — کس کی اُسے خبر جسے اپنی خبر نہ ہو

وہ بدگمانیاں ہیں نہ وہ سرگرانیاں — اتنی بھی دل کی دل کو الٰہی خبر نہ ہو

احسانِ عشق اصل میں توہینِ حسن ہے — حاضر ہیں دین و دل بھی ضرورت اگر نہ ہو

یا طالبِ دعا تھا میں ایک ایک سے جگر

یا خود یہ چاہتا ہوں دُعا میں اثر نہ ہو

(۴۹)

پھول بسر کرتے ہیں خاروں کے ساتھ کھیلتے ہیں ہم بھی شراروں کے ساتھ

کم نہ ہوئیں ان سے بھی کچھ ظلمتیں ! ربط بڑھایا تھا ستاروں کے ساتھ

عشق کہیں تجھ سے نہ لے انتقام چھیڑ نہ کر عشق کے ماروں کے ساتھ

ایک نظر، ایک دل ناتواں معرکہ درپیش ہزاروں کے ساتھ

عشق میں کیا ہے یہی معراجِ دید گم ہیں نگاہیں بھی نظاروں کے ساتھ

رقص میں ہے کب سے دلِ کائنات دیدہ و نادیدہ اشاروں کے ساتھ

لوٹ بہاریں نہ چمن کی بہت ! تو بھی نہ لٹ جائے بہاروں کے ساتھ

صبح ہے دور اور ابھی سے جگر ڈوب چلی نبض ستاروں کے ساتھ

جان فدا اوس پہ کہ جس نے جگر

زیست بسر کی نہ سہاروں کے ساتھ

(۵۰)

ابھی نہ روک نگاہوں کو پیرِ میخانہ — کہ زندگی ہے ابھی زندگی سے بیگانہ

فضائے کعبہ ہو یا سرزمینِ بت خانہ — ترے سوا نہ حقیقت، نہ کوئی افسانہ

سحر ہوئی وہ بڑھے ہاتھ سوئے پیمانہ — بنامِ شاہدِ نوخیز و پیرِ میخانہ

حدیثِ حسن، نہ شغلِ شراب و پیمانہ — یہ کس نے چھیڑ دیا زندگی کا افسانہ

مذاقِ عشق کی تفریق، اے معاذ اللہ — بہم ہوئے نہ کبھی عندلیب و پروانہ

ستم بھی ڈھائے کسی نے تو اس توجہ سے — کہ بن گیا دلِ صد پارہ آئینہ خانہ

جنونِ عشق کی کافرادائیاں توبہ — نگاہِ زہد بھی پڑنے لگی حریصانہ

وہیں وہیں سے اُٹھے ہیں ہزار ہا فتنے — جہاں جہاں سے میں گزرا ہوں بے نیازانہ

خود اپنی آگ میں جلتی ہے شمع جلنے دو — پرائی آگ میں جلنا ہے کارِ مردانہ

وہ ایک شعرِ مجسّم وہ ایک پیکرِ حسن (قطعہ) وہ سیرِ باغ بہ اندازِ بے نیازانہ

نظر نظر متبسّم، اگرچہ بے پروا! نفس نفس متوجّہ، اگرچہ بیگانہ

فدائے نیم نقابی تمام نکہت و رنگ

نثارِ نیم نگاہی، تمام مے خانہ

(۵۱)

(مسلسل)
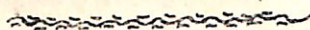
سراپا حقیقت، مجسّم فسانہ محبّت کا عالم، جنوں کا زمانہ

ہر شعرِ نغمہ، ہمہ رنگ و نکہت وہ جانِ تمنّا، وہ حُسنِ یگانہ

وہ پہلے پہل دونوں جانب یہ عالم ادا بے تعلّق، نظر مجرمانہ

نظر اُٹھتے اُٹھتے، نظر ملتے ملتے دھڑکتے دلوں کا وہ نازک فسانہ

حیا میں وہ معصوم سی اک شرارت شرارت میں موہوم سا اک فسانہ

وہ ہر چھیڑ میں اک نئی زندگانی وہ ہر بات میں اک نیا شاخسانہ

طبیعت شگفتہ مگر کھوئی کھوئی ہر انداز دلکش مگر والہانہ

وہ اخفائے رازِ محبت کی خاطر کبھی کچھ بہانہ، کبھی کچھ بہانہ

وہ اشک و تبسّم کا پُرکیف موسم وہ شعر و ترنم کا رنگیں زمانہ

کبھی روئے زیبا پہ غصّے کی لہریں کہ جیسے کوئی بجلیوں کا خزانہ

وہ با ربط سا اک طلسمِ معانی　　　　وہ بے ربط سا اک مسلسل فسانہ

جنونِ مکمل کا بھی ایک عالم　　　　سکوتِ مسلسل کا بھی اک زمانہ

غرورِ تحمّل، مگر زخم خوردہ

شکستِ محبّت، مگر فاتحانہ

(۵۲)
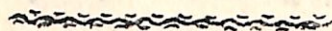
یہ فلک یہ ماہ و انجم، یہ زمین یہ زمانہ — ترے حُسن کی حکایت، مرے عشق کا فسانہ

یہ ہے عشق کی کرامت، یہ کمالِ شاعرانہ — ابھی منہ سے بات نکلی ابھی ہو گئی فسانہ

یہ علیل سی فضائیں، یہ مریض سازِ زمانہ — تری پاک تر جوانی، ترا حُسن معجزانہ

یہ مرا پیام کہنا تو صبا مؤدبانہ — کہ گذر گیا ہے پیارے تجھے دیکھے اک زمانہ

مجھے چاکِ جیب و دامن سے نہیں مناسبت کچھ — یہ جنوں ہی کو مبارک رہ و رسمِ عامیانہ

تجھے حادثاتِ پیہم سے بھی کیا ملیگا ناداں — ترا دل اگر ہو زندہ تو نفس بھی تازیانہ

تری اک نمود سے ہے، ترے اک حجاب تک ہے — مری فکرِ عرش پیما، مرا نازِ شاعرانہ

مجھے عشق کی صداقت پہ بھی شک سا ہو چلا ہے — مرے دل سے کہہ گئی کیا وہ نگاہِ ناقدانہ

تجھے اے جگر ہوا کیا کہ بہت دنوں سے پیارے

نہ بیانِ عشق و مستی، نہ حدیثِ دلبرانہ

لہ "آرٹ" کا حسن سمجھئے یا جو کچھ صرف اشارات سے کام لیا گیا ہے۔ جگر

(۵۳)

وہ ادائے دلبری ہو کہ نوائے عاشقانہ
جو دلوں کو فتح کرلے، وہی فاتح زمانہ

یہ ترا جمالِ کامل، یہ شباب کا زمانہ
دلِ دشمناں سلامت، دلِ دوستاں نشانہ

کبھی حُسن کی طبیعت، نہ بدل سکا زمانہ
وہی نازِ بے نیازی، وہی شانِ خسروانہ

میں ہوں اس مقام پر اب کہ فراق و وصل کیسے
مرا عشق بھی کہانی، ترا حسن بھی فسانہ

مری زندگی تو گذری ترے ہجر کے سہارے
مری موت کو بھی پیارے کوئی چاہئے بہانہ

ترے عشق کی کرامت یہ اگر نہیں تو کیا ہے
کبھی بے ادب نہ گذرا مرے پاس سے زمانہ

تری دُوری و حضوری کا ہے عجیب عالم
ابھی زندگی حقیقت، ابھی زندگی فسانہ

مرے ہمصفیر بلبل مرا تیرا ساتھ ہی کیا
(قطعہ) میں ضمیرِ دشت و دریا تو اسیرِ آشیانہ

میں وہ صاف ہی نہ کہہ دوں جو ہے فرق مجھ میں تجھ میں
ترا درد، دردِ تنہا، مرا غم غمِ زمانہ

ترے دل کے ٹوٹنے پر ہے کسی کو ناز کیا کیا
تجھے اے جگر مبارک یہ شکستِ فاتحانہ

(۵۴)

محبت کارفرمائے دو عالم ہوتی جاتی ہے
کہ ہر دُنیائے دل شائستۂ غم ہوتی جاتی ہے

ہر اک صورت ہر اک تصویر مبہم ہوتی جاتی ہے
الٰہی کیا مری دیوانگی کم ہوتی جاتی ہے

زمانہ گرمِ رفتارِ ترقی ہوتا جاتا ہے
مگر اک چشمِ شاعر ہے کہ پُرنم ہوتی جاتی ہے

جہانتک توڑتا جاتا ہوں رسمِ ظاہر و باطن
دلیلِ عاشقی اتنی ہی محکم ہوتی جاتی ہے

جہانتک دل کا شیرازہ فراہم کرتا جاتا ہوں
یہ محفل اور برہم اور برہم ہوتی جاتی ہے

نزاکت ہائے احساسِ محبت اے معاذ اللہ
کہ اب اک اک گھڑی ایک ایک عالم ہوتی جاتی ہے

غرورِ حُسن رُخصت الفراق اے نازِ خود بینی
مزاجِ حُسن سے اب تمکنت کم ہوتی جاتی ہے

یہی جی چاہتا ہے چھیڑتے ہی چھیڑتے رہیئے
بہت دلکش ادائے حُسنِ برہم ہوتی جاتی ہے

ارے توبہ یہ تکمیلِ شباب و حُسن ارے توبہ
کہ ہر ظالم ادا تقدیرِ عالم ہوتی جاتی ہے

تصوّر رفتہ رفتہ اک سراپا بنتا جاتا ہے
وہ اک شے جو مجھی میں ہے مجسّم ہوتی جاتی ہے

مری آنکھوں سے یارب روشنی کم ہوتی جاتی ہے — وہ رہ رہ کر گلے مل مل کے رخصت ہوتے جاتے ہیں

مری ہستی بھی کیا تیرا ہی عالم ہوتی جاتی ہے — جدھر سے میں گذرتا ہوں نگاہیں اُٹھتی جاتی ہیں

جگر تیرے سکوتِ غم نے یہ کیا کہہ دیا اُن سے

جُھکی پڑتی ہیں نظریں آنکھ پُرنم ہوتی جاتی ہے

(۵۵)

طبیعت ان دنوں بیگانۂ غم ہوتی جاتی ہے
مرے حصّے کی گویا ہر خوشی کم ہوتی جاتی ہے

سحر ہونے کو ہے بیدار شبنم ہوتی جاتی ہے
خوشی منجملۂ اسبابِ ماتم ہوتی جاتی ہے

قیامت کیا یہ اے حسنِ دو عالم ہوتی جاتی ہے
کہ محفل تو وہی ہے دلکشی کم ہوتی جاتی ہے

وہی میخانہ و صہبا، وہی ساغر، وہی شیشہ
مگر آوازِ نوشانوش مدّھم ہوتی جاتی ہے

وہی ہیں شاہد و ساقی مگر دل بجھتا جاتا ہے
وہی ہے شمع لیکن روشنی کم ہوتی جاتی ہے

وہی شورش ہے لیکن جیسے موجِ تہ نشیں کوئی
وہی دل ہے مگر آواز مدّھم ہوتی جاتی ہے

وہی ہے زندگی لیکن جگر یہ حال ہے اپنا
کہ جیسے زندگی سے زندگی کم ہوتی جاتی ہے

(۵۶)

کیا کشش حُسنِ بے پناہ میں ہے
جو قدم ہے اُسی کی راہ میں ہے

مے کدہ میں، نہ خانقاہ میں ہے
جو تجلّی دلِ تباہ میں ہے

ہائے وہ رازِ غم کہ جو اب تک
تیرے دل میں، مری نگاہ میں ہے

عشق میں کیسی منزلِ مقصود
وہ بھی اک گرد ہے جو راہ میں ہے

میں جہاں ہوں، ترے خیال میں ہوں
تو جہاں ہے مری، نگاہ میں ہے

حُسن کو بھی کہاں نصیب جگر
وہ جو اک شے مری نگاہ میں ہے

(۵۷)

کسی صورت نمودِ سوزِ پنہانی نہیں جاتی — بجھا جاتا ہے دل، چہرے کی تابانی نہیں جاتی

نہیں جاتی کہاں تک فکرِ انسانی نہیں جاتی — مگر اپنی حقیقت آپ پہچانی نہیں جاتی

نگاہوں کو خزاں نا آشنا بننا تو آ جائے — چمن جب تک چمن ہے جلوہ سامانی نہیں جاتی

پشیمانِ ستم وہ دل ہی دل میں رہتے ہیں لیکن — خوشا حسنے کہ طرزِ ناپشیمانی نہیں جاتی

مزاجِ اہلِ دل بے کیف و مستی رہ نہیں سکتا — کہ جیسے نکہتِ گل سے پریشانی نہیں جاتی

صداقت ہو تو دل سینوں سے کھنچنے لگتے ہیں واعظ — حقیقت خود کو منوا لیتی ہے مانی نہیں جاتی

بلندی چاہئے انساں کی فطرت میں پوشیدہ — کوئی ہو بھیس لیکن شانِ سلطانی نہیں جاتی

گئے وہ دن کہ دل سرمایہ دارِ درد پیہم تھا — مگر آنکھوں کی اب تک بے سر و سامانی نہیں جاتی

جسے رونق ترے قدموں نے دیکر چھین لی رونق — وہ لاکھ آباد ہو اُس گھر کی ویرانی نہیں جاتی

وہ یوں دل سے گزرتے ہیں کہ آہٹ تک نہیں ہوتی — وہ یوں آواز دیتے ہیں کہ پہچانی نہیں جاتی

مجھے تو کر دیا سیراب ساقی نے مرے لیکن
مری سیرابیوں کی تشنہ سامانی نہیں جاتی

نہیں معلوم کس عالم میں حُسنِ یار دیکھا تھا
کوئی عالم ہو لیکن دل کی حیرانی نہیں جاتی

جلے جاتے ہیں بڑھ بڑھ کر، مٹے جاتے ہیں گر گر کر
حضورِ شمع پروانوں کی نادانی نہیں جاتی

محبت میں اک ایسا وقت بھی دل پر گذرتا ہے
کہ آنسو خشک ہو جاتے ہیں طغیانی نہیں جاتی

جگر وہ بھی ز سر تا پا محبّت ہی محبّت ہیں
مگر اُن کی محبّت صاف پہچانی نہیں جاتی

(۵۸)
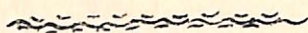
تکلّف سے تصنّع سے بری ہے شاعری اپنی

حقیقت شعر میں جو ہے، وہی ہے زندگی اپنی

نظر سے اُن کی پہلی ہی نظر یوں مل گئی اپنی

حقیقت میں تھی جیسے مدّتوں سے دوستی اپنی

وہ اُن کی بے رُخی، وہ بے نیازانہ ہنسی اپنی

بھری محفل تھی لیکن بات بگڑی بن گئی اپنی

جمال اُن کا مزاج اپنا، غم اُن کا، زندگی اپنی

حیاتِ حُسن ہے گویا حیاتِ عاشقی اپنی

یہاں تک تو جگر پہونچی ہے معراجِ خودی اپنی

کہ حُسن اک مشغلہ اپنا ہے عشق اک دل لگی اپنی

ہمیں کیوں اب کوئی سمجھائے، دل اپنا خوشی اپنی

گریباں اپنا، ہاتھ اپنے، جنوں اپنا، ہنسی اپنی

اسے سمجھے نہ سمجھے کوئی، لیکن واقعہ یہ ہے

کہ ترک مے کشی پر بھی وہی ہے مے کشی اپنی

جگر رہ جائے بن کر آہ جو اک کاسۂ سائل

نہ ایسی شاعری اپنی نہ ایسی زندگی اپنی
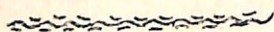
(۵۹)

اگر شامل نہ درپردہ کسی کی آرزو ہوتی　　تو پھر اے زندگی ظالم نہ میں ہوتا نہ تو ہوتی

اگر حائل نہ اس رُخ پر نقابِ رنگ و بُو ہوتی　　کسے تابِ نظر رہتی، مجالِ آرزو ہوتی

نہ اک مرکز پہ رُک جاتی، نہ یُوں بے آبرو ہوتی　　محبت جستجو تھی جستجو ہی جستجو ہوتی

ترا ملنا تو ممکن تھا مگر اے جانِ محبوبی　　مرے نزدیک توہینِ مذاقِ جستجو ہوتی

نگاہِ شوق اسے بھی ڈھال لیتی اپنے سانچے میں

اگر اک اور بھی دُنیا ورائے رنگ و بُو ہوتی

(۶۰)

وہی اُس نظر میں ہیں کھُب جانے والے — جو سینوں پہ ہیں برچھیاں کھانے والے

شکن کاش پڑ جائے اپنی جبیں پر — پریشاں بہت ہیں ستم ڈھانے والے

سراپا محبت بنے جا رہے ہیں — سلامت رہیں اُن کو بہکانے والے

بہ غور اپنی جانب بھی اے کاش دیکھیں — مرے حال پر رحم فرمانے والے

محبت کی باتیں، محبت ہی جانے — معمے نہیں ہیں یہ سمجھانے والے

ترے حُسن کا راز کیوں کر چھپاؤں — مرے دیدۂ و دل پہ چھا جانے والے

مری طاقتِ ضبط کی خیر یارب — کرم پر تُلے ہیں ستم ڈھانے والے

جو ہیں خاصِ چشم و چراغِ محبت!

وہ آنسو نہیں ہیں نظر آنے والے!

(۶۱)

آنکھوں میں بس کے، دل میں سما کر چلے گئے
خوابیدہ زندگی تھی، جگا کر چلے گئے

حسنِ ازل کی شان دکھا کر چلے گئے
اک واقعہ سا یاد دلا کر چلے گئے

چہرے تک آستین وہ لا کر چلے گئے
کیا راز تھا کہ جس کو چھپا کر چلے گئے

رگ رگ میں اس طرح وہ سما کر چلے گئے
جیسے مجھی کو مجھ سے چرا کر چلے گئے

میری حیاتِ عشق کو دے کر جنونِ شوق
مجھ کو تمام ہوش بنا کر چلے گئے

سمجھا کے پستیاں مرے اوجِ کمال کی
اپنی بلندیاں وہ دکھا کر چلے گئے

اپنے فروغِ حسن کی دکھلا کے وسعتیں
میرے حدودِ شوق بڑھا کر چلے گئے

ہر شے کو میری خاطرِ ناشاد کے لئے
آئینہ جمال بنا کر چلے گئے

آئے تھے دل کی پیاس بجھانے کے واسطے
اک آگ سی وہ اور لگا کر چلے گئے

آئے تھے چشمِ شوق کی حسرت نکالنے
سر تا قدم نگاہ بنا کر چلے گئے

اب کاروبارِ عشق سے فرصت مجھے کہاں
کونین کا وہ درد بڑھا کر چلے گئے

شکرِ کرم کے ساتھ یہ شکوہ بھی ہو قبول
اپنا سا کیوں نہ مجھکو بنا کر چلے گئے

لب تھرتھرا کے رہ گئے لیکن وہ اے جگرؔ
جاتے ہوئے نگاہ ملا کر چلے گئے
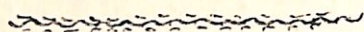
(۶۲)

وہ جو روٹھیں، یوں منانا چاہیئے　　زندگی سے روٹھ جانا چاہیئے

ہمتِ قاتل بڑھانا چاہیئے　　زیرِ خنجر مسکرانا چاہیئے

زندگی ہے نام جہد و جنگ کا　　موت کیا ہے؟ بھول جانا چاہیئے

ہے انہیں دھوکوں سے دل کی زندگی　　جو حسین دھوکا ہو کھانا چاہیئے

لذّتیں ہیں دشمنِ اوجِ کمال　　کلفتوں سے جی لگانا چاہیئے

اُن سے ملنے کو تو کیا کہئے جگر

خود سے ملنے کو زمانا چاہیئے

(۶۳)

برابر سے بچ کر گذر جانے والے	یہ نالے نہیں بے اثر جانے والے

نہیں جانتے کچھ کہ جانا کہاں ہے	چلے جا رہے ہیں مگر جانے والے

مرے دل کی بے تابیاں بھی لئے جا	دبے پاؤں منہ پھیر کر جانے والے

ترے اک اشارے پہ ساکت کھڑے ہیں	"نہیں" کہہ کے سب سے گذر جانے والے

محبت میں ہم تو جئے ہیں، جئیں گے
وہ ہوں گے کوئی اور مر جانے والے

(۶۴)

سودا جو اب ہے سر میں وہ سودا ہی اور ہے ‏ اس کا چمن ہی اور ہے صحرا ہی اور ہے

لیلائے آب و گل تو ہزاروں ہزار ہیں ‏ مجنوں ہے جس کی رُوح وہ لیلیٰ ہی اور ہے

جو حسنِ شش جہت سے نہ سیراب ہو سکی ‏ محسوس اب ہوا وہ تمنّا ہی اور ہے

خود حُسن استعارہ ہے جس کے جمال کا ‏ وہ جانِ حُسن، حُسنِ سراپا ہی اور ہے

جس سے کہ مطمئن ہو مری فطرتِ بلند ‏ شاید وہ حُسن و عشق کی دُنیا ہی اور ہے

صورت میں یہ فروغ یہ جذب و کشش کہاں ‏ در پردہ کوئی شاہدِ معنیٰ ہی اور ہے

یہ حُسنِ رنگ رنگ بھی کچھ کم نہ تھا جگر

کیا کیجئے کہ دل کا تقاضا ہی اور ہے

(۶۵)

یوں پرسشِ ملال وہ فرما کے رہ گئے
شکوے مری زباں تک آ آ کے رہ گئے

پہلے تو عرضِ غم پہ وہ جھنجلا کے رہ گئے
پھر کچھ سمجھ کے، سوچ کے، شرما کے رہ گئے

آئینہ چوم چوم رہے تھے وہ بار بار
دیکھا جو یک بہ یک مجھے شرما کے رہ گئے

وہ کون ہے کہ جو سرِ منزل پہونچ سکا
دھندلے سے کچھ نشان نظر آ کے رہ گئے

نغموں پہ میرے اور تو وہ کچھ نہ کہہ سکے
کچھ مسکرا کے پھول سے برسا کے رہ گئے

ہر شکر انتقامِ محبّت ہے اے جگر
شکوہ نہیں ہے اُن سے جو تڑپا کے رہ گئے

(۶۶)

پھر دل ہے قصدِ کوچۂ جاناں کئے ہوئے
رگ رگ میں نیشِ عشق کو پنہاں کئے ہوئے

پھر عزلتِ خیال سے گھبرا رہا ہے دِل
ہر وسعتِ خیال کو زنداں کئے ہوئے

پھر چشمِ شوق دیر سے لبریزِ شکوہ ہے
قطروں کو موج موج کو طوفاں کئے ہوئے

پھر جانِ بے قرار ہے آمادۂ فغاں
سو حشر اک سکوت میں پنہاں کئے ہوئے

پھر کیفِ بیخودی میں بڑھا جا رہا ہوں میں
سب کچھ نثارِ شوقِ فراواں کئے ہوئے

پھر سوئے خُلدِ حُسن کھنچا جا رہا ہے دِل
ہر جنّتِ نظّارہ کو ویراں کئے ہوئے

پھر بڑھ چلا ہے جوشِ طلب راہِ دوست میں
سَو فتح ہر شکست پہ قرباں کئے ہوئے

پھر بڑھ چلیں جنونِ تمنّا کی شورشیں
برہم نظامِ عالمِ امکاں کئے ہوئے

پھر ہے نگاہِ شوق کو دیدار کی ہوس
مدت ہوئی ہے جرأتِ عصیاں کئے ہوئے

پھر لے چلی ہے وحشتِ دل شہرِ حُسن میں
جنسِ گرانِ عشق کو ارزاں کئے ہوئے

پھر جی یہ چاہتا ہے کہ بیٹھے رہیں جگر
اُن کی نظر سے بھی انہیں پنہاں کئے ہوئے

(۶۷)

آئے ہیں پھر وہ عزمِ دل و جاں کئے ہوئے

پلکوں کی اوٹ حشر کا ساماں کئے ہوئے

پھر اُٹھ رہی ہے عارضِ پُرنور سے نقاب

نظّارہ و نظر کو پریشاں کئے ہوئے

پھر شام و صبح زلف و رُخِ یار ہیں بہم

ایماں کو کفر، کفر کو ایماں کئے ہوئے

پھر حُسنِ منفعل متبسّم ہے زیرِ لب

یک قطرہ اشک زینتِ مژگاں کئے ہوئے

(۶۸)

ہم نے دُنیا ہی میں دُنیا ے حقیقت دیکھی
یہیں دوزخ نظر آئی یہیں جنّت دیکھی

عشق کے بھیس میں جب حُسن کی صورت دیکھی
ہر ادا پھر تو قیامت ہی قیامت دیکھی

منفرد رنج، نہ تنہا کوئی راحت دیکھی
یہ تری نیم نگاہی کی شرارت دیکھی

جب تجھے دیکھ کے کونین کی وسعت دیکھی
حُسن ہی حُسن محبّت ہی محبّت دیکھی

نگہِ شوق کی محرومیِ تقدیر نہ پُوچھ
بن گئی وہ بھی فسانہ جو حقیقت دیکھی

حُسنِ بے نام نے رکھا تھا چھپا کر جس کو
وہ تجلّی بھی سرِ پردۂ حیرت دیکھی

اُس گنہگارِ محبّت کو خدا ہی سمجھے!
جس نے اُس مدھ بھری آنکھوں کی ندامت دیکھی!

(۶۹)

واعظ نے اور نہ زاہدِ شب زندہ دار نے
مجھ کو جگا دیا مرے دل کی پکار نے

تم کو غرورِ حسن ہے لیکن یہاں یہ فکر
چھوڑا ہے کس کو عشقِ دو عالم شکار نے

تسکینِ روح جب نہ کسی طرح ہو سکی
سب اپنی اپنی دھن میں لگے کچھ پکارنے

تکلیف و پردہ داریِ تکلیف الاماں
مارا ہے مجھ کو خود مرے صبر و قرار نے

طنزاً وہ دیکھتے ہیں مگر دیکھتے تو ہیں
یہ کام تو کیا دلِ ناکردہ کار نے

وہ عشق ہی نہیں ہے وہ دل ہی نہیں جگرؔ
لبیک خود کہا نہ جسے حسنِ یار نے!

(۷۰)

شبِ فراق ہے اور نیند آئی جاتی ہے
کچھ اس میں اُن کی توجہ بھی پائی جاتی ہے

یہ عمرِ عشق یُونہی کیا گنوائی جاتی ہے
حیات زندہ حقیقت بنائی جاتی ہے

بنا بنا کے جو دنیا مٹائی جاتی ہے
ضرور کوئی کمی ہے کہ پائی جاتی ہے

ہمیں پہ عشق کی تہمت لگائی جاتی ہے
مگر یہ شرم جو چہرے پہ چھائی جاتی ہے

خُدا کرے کہ حقیقت میں زندگی بن جائے
وہ زندگی جو زباں تک ہی پائی جاتی ہے

گناہگار کے دل سے نہ بچ کے چل زاہد
یہیں کہیں تری جنّت بھی پائی جاتی ہے

نہ سوزِ عشق نہ برقِ جمال پر الزام
دلوں میں آگ خوشی سے لگائی جاتی ہے

کچھ ایسے بھی ہیں رندانِ پاک باز جگر
کہ جن کو بے مے و ساغر پلائی جاتی ہے

(۱۷)

نقابِ حسنِ دو عالم اٹھائی جاتی ہے
مجھی کو میری تجلّی دکھائی جاتی ہے

قدم قدم مری ہمت بڑھائی جاتی ہے
نفس نفس تری آہٹ سی پائی جاتی ہے

وہ اک نظر جو بہ مشکل اٹھائی جاتی ہے
وہی نظر رگ و پے میں سمائی جاتی ہے

سکوں ہے موت یہاں ذوقِ جستجو کے لئے
یہ تشنگی وہ نہیں جو بجھائی جاتی ہے

خُدا وہ دردِ محبت ہر ایک کو بخشے
کہ جس میں رُوح کی تسکین بھی پائی جاتی ہے

وہ مے کدہ ہے، تری انجمن خدا رکھے
جہاں خیال سے پہلے پلائی جاتی ہے

ترے حضور یہ کیا وارداتِ قلب ہے آج
کہ جیسے چاند پہ بدلی سی چھائی جاتی ہے

تجھے خبر ہو تو اتنی نہ فرصتِ غم دے
کہ تیری یاد بھی اکثر ستائی جاتی ہے

وہ چیز، کہتے ہیں فردوسِ گمشدہ جس کو
کبھی کبھی تری آنکھوں میں پائی جاتی ہے

قریبِ منزلِ آخر ہے الفراق جگر!
سفر تمام ہوا، نیند آئی جاتی ہے!

(۷۲)

نہ اب مسکرانے کو جی چاہتا ہے
نہ آنسو بہانے کو جی چاہتا ہے

ستاتے نہیں وہ تو ان کی طرف سے
خود اپنے ستانے کو جی چاہتا ہے

کوئی مصلحت روک دیتی ہے، ورنہ
پلٹ دیں زمانے کو، جی چاہتا ہے

تجھے بھول جانا تو ہے، غیر ممکن
مگر بھول جانے کو، جی چاہتا ہے

تواضع کر اے عشق چند آنسوؤں سے
بہت مسکرانے کو، جی چاہتا ہے

بہت دیر تک چھپ کے تیری نظر سے
تجھے دیکھ پانے کو، جی چاہتا ہے

تری آنکھ کو بھی جو بے خواب کر دے
وہ فتنہ جگانے کو، جی چاہتا ہے

حسیں تیری آنکھیں، حسین تیرے آنسو
یہیں ڈوب جانے کو، جی چاہتا ہے

جگر اب تو وہ بھی یہ کہتے ہیں مجھ سے!
ترے ناز اٹھانے کو جی چاہتا ہے!

(۷۳)

جلوہ بہ قدرِ ظرفِ نظر دیکھتے رہے
کیا دیکھتے ہم اُن کو مگر دیکھتے رہے

اپنا ہی عکس پیشِ نظر دیکھتے رہے
آئینہ روبرو تھا جدھر دیکھتے رہے

کیا قہر تھا کہ پاس ہی دل کے لگی تھی آگ
اندھیر ہے کہ دیدۂ تر دیکھتے رہے

لاکھ آفتاب پاس سے ہو کر گذر گئے
بیٹھے ہم انتظارِ سحر دیکھتے رہے

ان کی حریم[ل] ناز کہاں اور ہم کہاں
نقش و نگارِ پردۂ در دیکھتے رہے

ایسی بھی کچھ فراق کی راتیں گذر گئیں
جیسے انہیں کو پیشِ نظر دیکھتے رہے

ہیں دورِ بے دلی کی وہ مجبوریاں بھی یاد
آنکھیں تھیں سوگوار مگر دیکھتے رہے

ہر لحظہ شانِ حسن بدلتی رہی جگر
ہر آن ہم جہانِ دگر دیکھتے رہے

[ل] اس لفظ کی "تذکیر" میرے مذاق شعری کو پسند نہیں اور میں اس کو ہمیشہ "تانیث" استعمال کرتا ہوں۔ جگر

(۷۴)

یہ مصرع کاش نقشِ ہر در و دیوار ہو جائے
"جسے جینا ہو مرنے کے لئے تیار ہو جائے"

وہی میخوار ہے جو اس طرح میخوار ہو جائے
کہ شیشہ توڑ دے اور بے پئے سرشار ہو جائے

دلِ انساں اگر شائستہ اسرار ہو جائے
لبِ خاموشِ فطرت ہی لبِ گفتار ہو جائے

ہر اک بیکار سی ہستی بہ روئے کار ہو جائے
جنوں کی روحِ خوابیدہ اگر بیدار ہو جائے

سنا ہے حشر میں ہر آنکھ اسے بے پردہ دیکھیگی
مجھے ڈر ہے نہ توہینِ جمالِ یار ہو جائے

حریمِ ناز میں اس کی رسائی ہو تو کیونکر ہو
کہ جو آسودہ زیرِ سایۂ دیوار ہو جائے

معاذ اللہ اس کی وارداتِ غم معاذ اللہ
چمن جس کا وطن ہو اور چمن بیزار ہو جائے

یہی ہے زندگی تو زندگی سے خودکشی اچھی
کہ انساں عالمِ انسانیت پر بار ہو جائے

اک ایسی شان پیدا کر کہ باطل تھرتھرا اٹھے
نظر تلوار بن جائے نفس جھنکار ہو جائے

یہ روز و شب یہ صبح و شام یہ بستی یہ ویرانہ
سبھی بیدار ہیں انساں اگر بیدار ہو جائے

(۷۵)

محبّت صلح بھی پیکار بھی ہے / یہ شاخِ گُل بھی ہے تلوار بھی ہے

طبیعت اس طرف خوددار بھی ہے / اُدھر نازک مزاجِ یار بھی ہے

ادائے عشق ادائے یار بھی ہے / بہت سادہ بہت پُرکار بھی ہے

یہ فتنے جن سے اک دُنیا ہے نالاں / انہی سے گرمیِ بازار بھی ہے

جنوں کے دم سے ہے نظمِ دو عالم / جنوں برہم زنِ افکار بھی ہے

نفس پر ہے مدارِ زندگانی / نفس چلتی ہوئی تلوار بھی ہے

اسی انساں میں سب کچھ ہے پنہاں / مگر یہ معرفت دشوار بھی ہے

وہ بوئے گل کہ ہے جانِ چمن بھی / قیامت ہے چمن بیزار بھی ہے

یہی دنیا ہے بستی آنسوؤں کی / یہی دُنیا تبسّم زار بھی ہے

جہاں وہ ہیں وہیں میرا تصوّر / جہاں میں ہوں خیالِ یار بھی ہے

خبردار! اے سُبک سارانِ ساحل ۔۔۔ یہ ساحل ہی کبھی منجدھار بھی ہے

غنیمت ہے کہ اس دَورِ ہوس میں ۔۔۔ ترا ملنا بہت دشوار بھی ہے

جو کوئی سُن سکے تو نکہتِ گل ۔۔۔ شکستِ رنگ کی جھنکار بھی ہے

ان آنکھوں کی زہے معجز بیانی

بہم انکار بھی، اقرار بھی ہے

(۷۶)

نہ تابِ مستی نہ ہوشِ ہستی کہ شکرِ نعمت ادا کرینگے

خزاں میں جب ہے یہ اپنا عالم، بہار آئی تو کیا کرینگے

ہر ایک غم کو فروغ دے کر یہاں تک آراستا کرینگے

وہی جو رہتے ہیں دُور ہم سے، خود اپنی آغوش وا کرینگے

جدھر سے گذرینگے سرفروشانہ کارنامے سنا کرینگے

وہ اپنے دل کو ہزار روکیں، مری محبت کو کیا کرینگے

نہ شُکرِ غم زیرِ لب کرینگے، نہ شکوۂ برملا کرینگے

جو ہم پہ گذریگی دل ہی دل میں کہا کرینگے سُنا کرینگے

ترے تصوّر سے حاصل اتنا کمال کسبِ ضیا کرینگے

جہاں کچھ آنسو ٹپک پڑینگے ستارے سجدے کیا کرینگے

یہ ظاہری جلوہ ہائے رنگیں فریب کب تک دیا کرینگے
نظر کی جو کر سکے نہ تسکیں، وہ دل کی تسکین کیا کرینگے

وہاں بھی آہیں بھرا کرینگے، وہاں بھی نالے کیا کرینگے
جنہیں ہے تجھ سے ہی صرف نسبت، وہ تیری جنّت کو کیا کرینگے

نہیں ہے جن کو مجالِ ہستی، سوائے اس کے وہ کیا کرینگے
کہ جس زمیں کے ہیں بسنے والے اُسے بھی رسوا کیا کرینگے

یہاں نہ دُنیا نہ فکرِ دُنیا، یہاں نہ عقبےٰ نہ فکرِ عقبےٰ
جنہیں سرِ ماسوا بھی ہوگا، وہی غمِ ماسوا کرینگے

ہم اپنی کیوں طرزِ فکر چھوڑیں، ہم اپنی کیوں وضعِ خاص بدلیں
کہ انقلاباتِ نَو بہ نَو تو ہوا کئے ہیں ہوا کرینگے

یہ سخت تر عشق کے مراحل، یہ ہر قدم پر ہزار احساں

جو بچ رہے تو جنوں کے حق میں جئیں گے جبتک دُعا کرینگے

یہ خام کارانِ عشق سوچیں، یہ شکوہ سنجانِ حُسن سمجھیں

کہ زندگی خود حسیں نہ ہوگی تو پھر تو جب وہ کیا کرینگے

خود اپنے ہی سوزِ باطنی سے نکال اک شمعِ غیر فانی

چراغِ دیر و حرم تو اے دل، جلا کرینگے بُجھا کرینگے
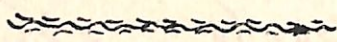
(۷۷)

کس کا خیال کون سی منزل نظر میں ہے
صدیاں گذر گئیں کہ زمانہ سفر میں ہے

چہرے پر برہمی ہے تبسّم نظر میں ہے
اب کیا کمی تباہیِ قلب و جگر میں ہے

اک روشنی سی آج ہر اک دشت و در میں ہے
کیا میرے ساتھ خود مری منزل سفر میں ہے

تسلیم حُسنِ دوست کی معصومیاں مگر
شامل کوئی تو فتنۂ شام و سحر میں ہے

صیّاد کی نظر میں وہ نشتر سے کم نہیں
اک لرزشِ خفی جو مرے بال و پر میں ہے

یارب! وفائے عذرِ محبّت کی خیر ہو
نازک سا اعتراف بھی آج اس نظر میں ہے

سمجھے تھے دُور تجھ سے نکل جائینگے کہیں
دیکھا تو ہر مقام تری رہ گذر میں ہے

کاریگرانِ شعر سے پُوچھے کوئی جگر
سب کچھ تو ہے مگر یہ کمی کیوں اثر میں ہے

(۷۸)

زندگی ہے مگر پرائی ہے! مرگِ غیرت! تری دہائی ہے

جب مسرّت قریب آتی ہے غم نے کیا کیا ہنسی اُڑائی ہے

حُسن نے جب شکست کھائی ہے عشق کی جان پر بن آئی ہے

عشق کو زعمِ پارسائی ہے حُسنِ کافر! تری دُہائی ہے

ہائے وہ سبزۂ چمن کہ جسے سایۂ گل میں نیند آئی ہے

عشق ہے اس مقام پر کہ جہاں زندگی نے شکست کھائی ہے

خاکِ منزل کو منہ سے ملتا ہوں یادگارِ شکستہ پائی ہے

اُس نے اپنا بنا کے چھوڑ دیا کیا اسیری ہے کیا رہائی ہے

ہجر سے شاد، وصل سے ناشاد

کیا طبیعت جگر نے پائی ہے

(۷۹)

اگر جمالِ حقیقت سے ربط محکم ہے
نفس نفس میں نئی زندگی کا عالم ہے

نہیں مقابلہ کوئی، مگر یہ کیا کم ہے
خود آفتابِ درخشاں حریفِ شبنم ہے

الٰہی خیر! یہ کیا شام ہی سے عالم ہے
کہ جیسے آج ستاروں میں روشنی کم ہے

نہ کوئی خلد نہ زاہد! کوئی جہنّم ہے
خود اپنی اپنی نظر، اپنا اپنا عالم ہے

ہر ایک قطرے میں دریائے معرفت ہے رواں
مگر نصیب ہو کیونکر کہ پیاس ہی کم ہے

ابھی کمال کو پہونچی نہیں ہے فطرتِ عشق
کہ آدمی کو ہنوز انتظارِ آدم ہے

جنوں بھی ساتھ نہ دے اب تو کچھ نہیں پروا
خوشا کہ تیری نگاہوں سے ربط محکم ہے

جو گوشِ دل شنوا ہو تو بزمِ ہستی میں
سکوتِ ساز بھی اک نغمۂ مجسّم ہے

خزاں کا رنج کرے عشق میں بلا میری
نہیں بہار تو یادِ بہار کیا کم ہے

حسین و سادہ ہے کس درجہ فطرتِ شاعر
ہنسے تو غنچہ و گُل، رو پڑے تو شبنم ہے

خوشی میں بھول نہ جانا جگر یہ رازِ حیات
کہ جو خوشی ہے یہاں اک امانتِ غم ہے

(۸۰)

حسن و صورت کے نہ حسرت کے نہ ارمانوں کے

اُف کہ انساں ہیں مارے ہوئے انسانوں کے

کیا مقامات ہیں ان سوختہ سامانوں کے

خضر خود بڑھ کے قدم لیتے ہیں دیوانوں کے

انہی ذرّات میں خاموش سے ویرانوں کے

دل دھڑکتے نظر آئے مجھے انسانوں کے

جلوۂ دوست، یہ آہستہ خرامی تاچند

ندّیاں سوکھ چلیں شوق میں طوفانوں کے

موجِ مے، رنگِ شفق، لالہ و گل، مطلعِ صبح

چند عنواں ہیں مرے شوق کے افسانوں کے

اُسی کشتی کو نہیں تابِ تلاطم، صد حیف

جس نے منہ پھیر دئے تھے کبھی طوفانوں کے

حُسن کی جلوہ گری سے ہے محبت کا جنوں

شمع روشن ہوئی، پَر لگ گئے پروانوں کے

مرحبا! جذبۂ بیباکِ جوانانِ وطن

تیغِ چم خم ہے مگر ہاتھ ہیں نادانوں کے

ناز ہے شاہدِ فطرت کو بھی جن پر ہمدم

وہ چمن سب ہیں لگائے ہوئے دیوانوں کے

میں نے دیکھا ہے اُسے روپ میں فطرت کے جگر

میں نے پایا ہے اُسے بھیس میں انسانوں کے!

(٨١)

رگ رگ میں ایک برقِ خراماں لئے ہوئے — دل ہے ہوائے منزلِ جاناں لئے ہوئے

دل ہے تجلّیات کا طوفاں لئے ہوئے — لیکن حجابِ دیدۂ حیراں لئے ہوئے

ناصح گدازِ عشق کی معراج دیکھنا — ہر قطرہ خون ہے شمعِ فروزاں لئے ہوئے

وہ سامنے تو آئے مگر اس ادا کیساتھ — اِک طرزِ التفاتِ گریزاں لئے ہوئے

دل کو ہے کیوں گلہ کہ بظاہر تو وہ نگاہ — نشتر لئے ہوئے ہے نہ پیکاں لئے ہوئے

کانٹوں میں ہیں جیسے پھول، جہنم میں جیسے خلد — آنکھیں ہیں یوں ندامتِ عصیاں لئے ہوئے

اہلِ سلامتی کی طرف سے اُسے سلام — کشتی جو غرق ہو گئی طوفاں لئے ہوئے

دل میں کہاں اُمید و تمنّا کا وہ ہجوم — پھرتا ہوں ایک جنّتِ ویراں لئے ہوئے

ہونا تھا چاک چاک گریباں کو اے جنوں — لیکن کسی کا گوشۂ داماں لئے ہوئے

ہر مرحلے سے عشق گذرتا چلا گیا — دِل میں ادائے حُسنِ گریزاں لئے ہوئے

پھولوں کو نازِ حسن اگر ہے تو ہو مگر

کانٹے بھی ہیں غرورِ گلستاں لئے ہوئے

(۸۲)

کس کا خیال ہے دلِ مضطر لئے ہوئے
آنکھیں ہیں رنگ و بوئے گل تر لئے ہوئے

آئی ہے موت حُسن کا منظر لئے ہوئے
لیکن غمِ حیات مکرّر لئے ہوئے

ہر لحظہ اک سرورِ تبسّم لئے ہوئے
خود زندگی ہے بادہ و ساغر لئے ہوئے

ہشیار اے نگاہِ ستم آشنائے دوست
دل بھی ہے اک لطیف سا نشتر لئے ہوئے

کونین کی ہوس میں ہے انساں ذلیل و خوار
کونین اپنے سینے کے اندر لئے ہوئے

دنیا بھی کیا مقام ہے جس میں کہ بارہا
ہنسنا پڑا ہے قلبِ مکدّر لئے ہوئے

شرمِ گنہ سے بڑھ کے ہے عفوِ گنہ کی شرم
(قطعہ) یارب کہاں میں جاؤں یہ نشتر لئے ہوئے

عصیاں کا بار ہٹ تو گیا سر سے اے کریم
لیکن ہوں ایک بوجھ سا دل پر لئے ہوئے

اللہ رے بے بسی کہ غمِ روزگار بھی
بیٹھا ہوں ترے غم کے برابر لئے ہوئے

اُف رے تجلّیِ رُخِ ساقی کہ بادہ کش
رہ رہ گئے ہیں ہاتھ میں ساغر لئے ہوئے

آنکھیں ابھی کچھ اور بھی ہیں منتظر جگر
پھرا کی قتل گاہ کا منظر لئے ہوئے

(۸۳)

راز جو سینۂ فطرت میں نہاں ہوتا ہے　　سب سے پہلے دلِ شاعر پہ عیاں ہوتا ہے

سخت خونریز جب آشوبِ جہاں ہوتا ہے　　نہیں معلوم یہ انساں کہاں ہوتا ہے

جب کوئی حادثۂ کون و مکاں ہوتا ہے　　ذرّہ ذرّہ میری جانب نگراں ہوتا ہے

جو نظر کردۂ صاحب نظراں ہوتا ہے　　اُسی دیوانے کے قدموں پہ جہاں ہوتا ہے

جب کوئی عشق میں بربادِ جہاں ہوتا ہے　　مجھ کو محسوس خود اپنا ہی زیاں ہوتا ہے

متزلزل ہے ادب گاہِ محبت کی زمیں　　کوئی دیکھے تو، یہ ہنگامہ کہاں ہوتا ہے

کہیں ایسا تو نہیں، وہ بھی ہو کوئی آزار　　(قطعہ) تجھ کو جس چیز پہ راحت کا گماں ہوتا ہے

دل غنی ہو تو ہر اک رنج بھی دل کی راحت　　ذہن مفلس ہو تو ہر سود زیاں ہوتا ہے

(قطعہ)

موت کے نام سے جس کو خفقاں ہوتا ہے امتحاں گاہِ محبّت میں نہ رکھّے وہ قدم

ختم ہر مرحلۂ سود و زیاں ہوتا ہے یہی وہ منزلِ دشوار ہے جس منزل میں

ہر نفس سانحۂ مرگِ جواں ہوتا ہے ہر قدم معرکۂ کرب و بلا ہے درپیش

ناز جس خاکِ وطن پر تھا مجھے آہ جگر

اسی جنّت پہ جہنّم کا گماں ہوتا ہے
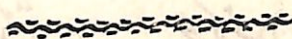
(۸۴)

حسن جس رنگ میں ہوتا ہے جہاں ہوتا ہے　　اہلِ دل کے لئے سرمایۂ جاں ہوتا ہے

ہائے وہ وقت کہ جب حسن پہ آتا ہے شباب　　اُف وہ ہنگام کہ جب عشق جواں ہوتا ہے

کبھی اک زندہ حقیقت نظر آتا ہے جہاں　　کبھی ہر علم و یقیں وہم و گماں ہوتا ہے

دل کو بے دردِ محبت ہیں بتانے والے　　دل سا ہمدرد زمانے میں کہاں ہوتا ہے

وقت آتا ہے اک ایسا بھی محبت میں کہ جب　　دل پہ احساسِ محبت بھی گراں ہوتا ہے

ہائے وہ سلسلۂ اشک کہ جو تیرے حضور　　دل میں رکتا ہے نہ آنکھوں سے رواں ہوتا ہے

عزم بیباک اگر ہو تو کہاں کی دوری　　حسن خود منتظرِ عشق جواں ہوتا ہے

شرح و تفصیل سے بیگانہ گذر جائے دوست　　(قطعہ) عقل بڑھتی ہے مگر دل کا زیاں ہوتا ہے

روح بن جاتی ہے خود نغمۂ بے ساز و صدا　　ختم جب معرکۂ لفظ و بیاں ہوتا ہے

(قطعہ)

وسعتِ فکر و نظر بھی نہ مجھے راس آئی
ہر تبسّم پہ جراحت کا گماں ہوتا ہے

ساز و مطرب کے کرشموں پہ نہ جانا کہ یہاں
اکثر اس طرح سے بھی رقصِ فغاں ہوتا ہے

انقلابات سے کیا خوف کہ ہر عزم جگر
اسی آغوش میں پلتا ہے، جواں ہوتا ہے
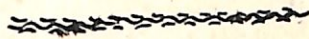
(۸۵)

آج بھی یوں تو ہر اک رند جواں ہے ساقی
مگر اک آن جو پہلے تھی کہاں ہے ساقی

زندگی سلسلۂ خوابِ گراں ہے ساقی
لا تو وہ فتنۂ بیدار کہاں ہے ساقی

حرم و دیر کا چھٹنا تو گوارا، لیکن
دل کو آرام وہاں تھا، نہ یہاں ہے ساقی

طنز و تعریض کی آخر کوئی حد ہوتی ہے
آدمی ہوں، مرے منہ میں بھی زباں ہے ساقی

اپنے منصب کا نہ احساس، نہ رندوں کی خبر
دیر سے آج خدا جانے کہاں ہے ساقی

زلیست ہے یا تری نظروں کے اشاراتِ لطیف
موجِ صہبا ہے کہ فردوس رواں ہے ساقی

(۸۶)

ہر وہ حلقہ جو تری کاکلِ شب گیر میں ہے
گوشۂ امن بلاخانۂ زنجیر میں ہے

شاہدِ رُوح کہاں، جلوہ گہِ ناز کہاں
خاک مصروف ابھی خاک کی تعمیر میں ہے

کون سمجھائے یہ قاصد کو دمِ رخصتِ شوق
رابطۂ محکم اسی بے ربطیِ تحریر میں ہے

اپنے سر آپ لیں دل شکنی کا الزام!
مجھکو معلوم ہے، جو کچھ مری تقدیر میں ہے

خود کھنچے آتے ہیں زنداں کی طرف دیوانے
کوئی تو وجہِ کشش نالۂ زنجیر میں ہے

دیکھنا جبرِ مشیّت کہ بقیدِ زنداں
پاؤں زنجیر سے باہر ہے نہ زنجیر میں ہے

چھُپ کے پھروں اُسے اے دیکھنے والے یہ بتا
مجھ میں کیا بات نہیں، جو مری تصویر میں ہے

(۸۷)

شرما گئے، لجا گئے، دامن چھڑا گئے
اے عشق! مرحبا، وہ یہاں تک تو آ گئے

دل پر ہزار طرح کے اوہام چھا گئے
یہ تم نے کیا کیا، مری دنیا میں آ گئے

سب کچھ لُٹا کے راہِ محبت میں اہلِ دل
خوش ہیں کہ جیسے دولتِ کونین پا گئے

صحنِ چمن کو اپنی بہاروں پہ ناز تھا
وہ آ گئے تو ساری بہاروں پہ چھا گئے

عقل و جنوں میں سب کی تھیں راہیں جُدا جُدا
ہر پھر کے لیکن ایک ہی منزل پہ آ گئے

اب کیا کروں میں فطرتِ ناکامِ عشق کو!
جتنے تھے حادثات، مجھے راس آ گئے

(٨٨)

یوں تو ہونے کو گلستاں بھی ہے، ویرانہ بھی ہے

دیکھنا یہ ہے کہ ہم میں کوئی دیوانہ بھی ہے!

بات سادہ ہی سہی، لیکن حکیمانہ بھی ہے

یعنی ہر انساں بقدرِ ہوش دیوانہ بھی ہے!

ہوشیار اُو مستِ صہبائے تغافل ہوشیار

عشق کی فطرت میں اک شانِ حریفانہ بھی ہے!

ہوش میں رہتا، تو کیا جانے کہاں رکھتا قدم

یہ غنیمت ہے مزاجاً عشق دیوانہ بھی ہے!

کس جگہ واقع ہوا ہے حضرتِ واعظ کا گھر

دُور مسجد بھی نہیں، نزدیک مے خانہ بھی ہے!

مِلتا جلتا ہے مزاجِ حُسن ہی سے رنگِ عشق

شمع گر بیباک ہے، گستاخ پروانہ بھی ہے!

زندگانی تا کجا صرفِ مئے جام و سبُو

بے خبر، مے خانہ میں اک اور میخانہ بھی ہے!

خیر ہے زاہد، یہ کیسا انقلاب آیا کہ آج

تیرے ہر انداز میں اک کیف رندانہ بھی ہے!

حاصلِ ہر جستجو آخر یہی نکلا جگر

عشق خود منزل بھی ہے، منزل سے بیگانہ بھی ہے

(۸۹)

ہر تجلّی یہیں نظر آئی　　اُف رے تیری حجاب آرائی

دل نے لغزش جہاں کوئی کھائی　　ایک آواز کان میں آئی

یوں تو وہ شکوہ سنج رسوائی　　اور در پردہ ہمّت افزائی

زندگی تُو ہمیں کہاں لائی　　اک محبت ! ہزار رسوائی

مجکو شکوہ ہے اپنی آنکھوں سے　　تم نہ آئے تو نیند کیوں آئی

نیچی نظروں سے دیکھنے والے　　دیکھنا زخمِ دل کی گہرائی

عشق کی بدحواسیاں تو بہ !　　بارہا خود مجھے ہنسی آئی

عشق میں عشق کی بلا جانے　　ناپذیرائی و پذیرائی

دو دل اس طرح مل گئے ناگاہ　　جیسے برسوں کی ہو شناسائی

پھُول بنّا تھا، مُسکرانا تھا　　وہ کلی ہی نہ تھی جو مُرجھائی

کارگاہِ حیات میں اے دوست (قطعہ) یہ حقیقت مجھے نظر آئی

ہر اُجالے میں تیرگی دیکھی ہر اندھیرے میں روشنی پائی

اب یہ محسوس ہو چلا ہے جگرؔ

موت ہے زندگی کی تنہائی
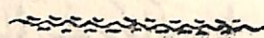
~~~

(۹۰)

خود وہ اُٹھے ہیں جام لئے اب وہ ہے کافر جو نہ پئے

ان کی بلا سے ان کے لئے کوئی مرے یا کوئی جئے

ہم بھی گرے سو بار مگر

اُن کو بھی اپنے ساتھ لئے

~~~

(۹۱)

جان کر من جملۂ خاصانِ مے خانہ مجھے

مُدتوں رویا کریں گے جام و پیمانہ مجھے

ننگِ مے خانہ تھا میں ساقی نے یہ کیا کر دیا

پینے والے کہہ اُٹھے "یا پیرِ مے خانہ" مجھے

سبزہ و گُل، موج و دریا، انجم و خورشید و ماہ

اک تعلق سب سے ہے، لیکن رقیبانہ مجھے

زندگی میں آ گیا جب کوئی وقتِ امتحاں

اُس نے دیکھا ہے جگرؔ بے اختیارانہ مجھے

(۹۲)

آ پڑا کچھ وقت ایسا گردشِ ایّام سے
زندگی شرما رہی ہے زندگی کے نام سے

جب کبھی بچ کر چلا ہوں جلوہ گاہِ عام سے
بچ گئے ہیں خود مری فکر و نظر کے دام سے

کچھ انہیں بھی ربط میری حسرتِ ناکام سے
اور کچھ ہیں بھی گریزاں التفاتِ عام سے

ہو گیا ہے درہم و برہم نظامِ میکدہ !
جب کبھی توبہ مری ٹکرا گئی ہے جام سے

اُن کی محفل کا تو کیا کہنا مگر اے ہم نشیں
رنگِ محفل کہہ رہا ہے دل ہیں بے آرام سے

آج کل میخانہ میں تقسیم ہوتے ہیں جگر
زہر کے ساغر شرابِ زندگی کے نام سے

(۹۳)

جہلِ خرد نے دن یہ دکھائے
گھٹ گئے انساں بڑھ گئے سائے

ہائے وہ کیوں کر دل بہلائے
غم بھی جس کو راس نہ آئے

ضد پر عشق اگر آ جائے
پانی چھڑکے، آگ لگائے

دل پہ کچھ ایسا وقت پڑا ہے
بھاگے لیکن راہ نہ پائے

کیسا مجاز اور کیسی حقیقت
اپنے ہی جلوے اپنے ہی سائے

جھوٹی ہے ہر ایک مسّرت!
رُوح اگر تسکین نہ پائے

کارِ زمانہ جتنا جتنا
بنتا جائے بگڑتا جائے

ضبطِ محبّت شرطِ محبّت
جی ہے کہ ظالم اُمڈا آئے

حُسن وُہی ہے حُسن، جو ظالم
ہاتھ لگائے ہاتھ نہ آئے (قطعہ)

نغمہ وہی ہے نغمہ کہ جس کو
رُوح سُنے اور رُوح سُنائے

راہِ جنوں آسان ہوئی ہے
زلف و مژہ کے سائے سائے

(۹۴)

صحنِ کعبہ نہ سہی، کوئے صنم خانہ سہی

خاک اڑانی ہے تو پھر کوئی بھی ویرانہ سہی

زندگی تلخ حقیقت کے سوا کچھ بھی نہیں

اس میں کچھ چاشنیِ مشربِ رندانہ سہی

آپ سے جس کو ہو نسبت، وہ جنوں کیا کم ہے

دونوں عالم نہ سہی، اک دلِ دیوانہ سہی

اپنی شوریدہ مزاجی کو کہاں لے جاؤں

تیرا ایمانہ سہی، تیرا اشارا نہ سہی

زندگی فرشِ قدم بن کے بچھی جاتی ہے

اے جنوں! اور بھی اک لغزشِ مستانہ سہی

یہ ہوائیں، یہ گھٹائیں، یہ فضائیں، یہ بہار
محتسب آج تو شغلِ مے و پیمانہ سہی

حُسن خود پردہ کشائے رُخِ مقصود تو ہے
عشق کو حوصلۂ عرضِ تمنّا نہ سہی

کون ایسا ہے یہاں، عشق ہے جسکا بے لاگ
آپ کی جان سے دُور آپ کا دیوانہ سہی

زندگی آج بھی دلکش ہے انہیں کے دم سے
حُسن اک خواب سہی، عشق اک افسانہ سہی

تشنہ لب ہاتھ پہ کیوں ہاتھ دھرے بیٹھے ہیں
کچھ نہیں ہے تو شکستِ خم و خم خانہ سہی

میں نہ زاہد سے ہوں شرمندہ، نہ صوفی سے جگر
مسلکِ عشق مرا، مسلکِ رندانہ سہی

(۹۵)

یہ رازِ ہم پہ ہوا نہ افشا کسی کی خاص اک نظر سے پہلے

کہ تھی ہماری ہی کم نگاہی، ہمیں تھے کچھ بے خبر سے پہلے

یہ زندگی، خاک زندگی تھی، گدازِ قلب و جگر سے پہلے

ہر ایک شے غیر معتبر تھی ترے غمِ معتبر سے پہلے

تجھے ہو سیرِ چمن مبارک، مگر یہ رازِ چمن بھی سن لے

کلی کلی خون ہو چکی تھی، شگفتِ گل ہائے تر سے پہلے

کہاں کہاں اڑ کے پہنچے شعلے، یہ ہوش کس کو، یہ کون جانے

ہمیں بس اتنا ہے یاد اب تک، لگی تھی آگ اپنے گھر سے پہلے

قفس کی نازک سی تیلیوں کی بھی کچھ حقیقت ہے ہمصفیرو

مگر الجھنا پڑے گا شاید خود اپنے ہی بال و پر سے پہلے

کہاں یہ شورش، کہاں یہ مستی، کہاں یہ رنگینیوں کا عالم
زمانہ خواب و خیال سا تھا، ترے فسونِ نظر سے پہلے

خوشا یہ بیماریٔ محبت زہے یہ خود داریٔ طبیعت
وہی ہیں مصروفِ دلنوازی، وہی جو تھے بیخبر سے پہلے

زمانہ مانے، نہ مانے، لیکن ہمیں یہی ہے یقینِ کامل
جہاں اُٹھا کوئی تازہ فتنہ، اٹھا تری رہگذر سے، پہلے

اگرچہ ذوقِ نظارہ میں بھی ہزار سرمستیاں بھری تھیں
مگر یہ بیباکیاں کہاں تھیں، ترے حجابِ نظر سے پہلے

اٹھا جو چہرے سے پردۂ شب، سمٹ کے مرکز پہ آگئے سب
تمام جلوے جو منتشر تھے، طلوعِ حسنِ بشر سے پہلے

مری طبیعت کو حسنِ فطرت سے ربطِ باطن نہ جانے کیا ہے
مری نگاہیں کبھی نہ اُٹھیں طہارتِ چشمِ تر سے پہلے

وہ یادِ آغازِ عشق، اب تک انیسِ جان و دلِ حزیں ہے

وہ اک جھجک سی، وہ اک جھپک سی، ہر التفاتِ نظر سے پہلے

ہمیں تھے کیا جستجو کا حاصل، ہمیں تھے کیا آپ اپنی منزل

وہیں پہ آکر ٹھہر گیا دل، چلے تھے جس رہ گذر سے پہلے

بس ایک دل اور کیف و لذّت، بس ایک ہم اور جمالِ فطرت!

یہ زندگی کس قدر حسیں تھی، شعورِ فکر و نظر سے پہلے

ہمارے شوقِ جنوں ادا کی، ستم ظریفی تو کوئی دیکھے!

کہ نامہ بر کو روانہ کر کے، پہنچ گئے نامہ بر سے پہلے

کہاں تھی یہ روح میں لطافت، کہاں تھی کونین میں یہ وسعت

حیات ہی جیسے سو رہی تھی کسی کی پہلی نظر سے پہلے

یہ نالہ کیوں ہے؟ یہ نغمہ کیوں ہے؟ یہ آہ کیسی؟ یہ واہ کیسی؟

یہ پوچھ لے آئینے کے دل سے، نہ پوچھ اپنے جگر سے پہلے

(۹۶)

اگر نہ زہرہ جبینوں کے درمیاں گذرے

تو پھر یہ کیسے کٹے زندگی، کہاں گذرے

جو تیرے عارض و گیسو کے درمیاں گذرے

کبھی کبھی وہی لمحے بلائے جاں گذرے

مجھے یہ وہم رہا مُدتوں کہ جُرأتِ شوق

کہیں نہ خاطرِ معصوم پر گراں گذرے

ہر اک مقامِ محبت بہت ہی دل کش تھا

مگر ہم اہلِ محبت کشاں کشاں گذرے

جنوں کے سخت مراحل بھی تیری یاد کے ساتھ

حسیں حسیں نظر آئے، جواں جواں گذرے

مری نظر سے تری جستجو کے صدقے ہیں

یہ اک جہاں ہی نہیں، سینکڑوں جہاں گذرے

ہجومِ جلوہ میں پروازِ شوق، کیا کہنا!

کہ جیسے روح ستاروں کے درمیاں گذرے

خطا معاف، زمانے سے بدگماں ہوکر!

تری وفا پہ بھی کیا کیا ہمیں گماں گذرے

مجھے تھا شکوۂ ہجراں، کہ یہ ہوا محسوس!

مرے قریب سے ہوکر وہ ناگہاں گذرے

رہِ وفا میں اک ایسا مقام بھی آیا!

کہ ہم خود اپنی طرف سے بھی بدگماں گذرے

خلوص جس میں ہو شامل، وہ دورِ عشق و ہوس

نہ رائیگاں کبھی گذرا، نہ رائیگاں گذرے

اسی کو کہتے ہیں جنّت، اسی کو دوزخ بھی

وہ زندگی جو حسینوں کے درمیاں گذرے

بہت حسین مناظر بھی، حُسنِ فطرت کے

نہ جانے آج طبیعت پہ کیوں گراں گذرے

وہ جن کے سائے سے بھی بجلیاں لرزتی تھیں

مری نظر سے کچھ ایسے بھی آشیاں گذرے

مرا تو فرض چمن بندیِ جہاں ہے فقط !

مری بلا سے، بہار آئے یا خزاں گذرے

کہاں کا حسن، کہ خود عشق کو خبر نہ ہوئی

رہِ طلب میں کچھ ایسے بھی امتحاں گذرے

بھری بہار میں تاراجیِ چمن، مت پوچھ !

خدا کرے نہ پھر آنکھوں سے وہ سماں گذرے

کوئی نہ دیکھ سکا جن کو، دو دلوں کے سوا

معاملات کچھ ایسے بھی درمیاں گذرے

کبھی کبھی تو اسی ایک مشتِ خاک کے گرد

طواف کرتے ہوئے ہفت آسماں گذرے

بہت حسین سہی صحبتیں گُلوں کی مگر

وہ زندگی ہے جو کانٹوں کے درمیاں گذرے

(قطعہ)

ابھی سے تجھ کو بہت ناگوار ہیں ہمدم

وہ حادثات جو ابتک رواں دواں گذرے

جنہیں کہ دیدۂ شاعر ہی دیکھ سکتا ہے

وہ انقلاب ترے سامنے کہاں گذرے

بہت عزیز ہے مجھ کو انہیں کی یاد جگر

وہ حادثاتِ محبت جو ناگہاں گذرے

(۹۷)

آدمی، آدمی سے مِلتا ہے — دل مگر کم کسی سے ملتا ہے

بھُول جاتا ہوں میں ستم اس کے — وہ کچھ اس سادگی سے ملتا ہے

آج کیا بات ہے، کہ پھُولوں کا — رنگ تیری ہنسی سے ملتا ہے

سلسلۂ فتنۂ قیامت کا — تیری خوش قامتی سے ملتا ہے

مل کے بھی جو کبھی نہیں مِلتا — ٹوٹ کر دل اُسی سے ملتا ہے

کاروبارِ جہاں سنورتے ہیں — ہوش جب بیخودی سے ملتا ہے

رُوح کو بھی مزا محبّت کا

دل کی ہمسائگی سے ملتا ہے

(۹۸)

افشاں

لطیف طبع کو لازم ہے سوزِ غم بھی لطیف
چمن میں آتشِ گل کا کبھی دھواں نہ رہا

ہم نامرادِ شوق ہوئے بھی تو کیا جئے
آنا تھا مفت یہ بھی اک الزام آ گیا

کیا کیا نگاہِ دوست ہوئی مجھ سے بدگماں
دم بھر کے واسطے بھی جو آرام آ گیا

کیا کرے گا وہ کسی اور کا شیدا ہو کر
جس نے اپنے کو نہ سمجھا کبھی اپنا ہو کر

طعن کیا کیا نہ فرشتوں نے کئے تھے جس پر
عرش پیما ہے وہی خاک کا پتلا ہو کر

ہے جو ملنا ہی مقدر تو برابر سے ملے
قطرہ دریا میں سمائے بھی تو دریا ہو کر

چھُپتا ہے کہیں بانیِ بیداد کا عالم — ہونٹوں پہ تبسم ہے کہ فریاد کا عالم

دیکھ اے نگہِ شوق، یہیں تک نہ ٹھہرنا — اک اور بھی ہے حسنِ خداداد کا عالم

~~~~~~~~~~

بجھے گی سوزِ غم سے رُوح کی پیاس — اسی شعلہ کو بن جانا ہے شبنم!

~~~~~~~~~~

اُن کی جفا پہ ترکِ وفا کر رہا ہوں میں — سائے کو زندگی سے جُدا کر رہا ہوں میں

میری ادائے شُکرِ حضوری تو دیکھنا — صد شکوۂ فراق نما کر رہا ہوں میں

~~~~~~~~~~

اللہ اللہ آج حسنِ دوست کی غمازیاں — عشق ہی کو صرف اپنا رازداں سمجھا تھا میں

~~~~~~~~~~

اے غضب، ارے ستم، وہ اک نگاہِ سحر فن — جھکے اگر تو بت کدہ، اُٹھے اگر تو بت شکن

دیکھا ہے عشق ہی میں یہ عالم بھی بارہا	جس کا معاملہ ہو اُسی کو خبر نہ ہو

~~~~~~~~~~~~~~~~

جگرؔ ان حوادث سے گھبرا نہ جانا	یہی تو ہے دلچسپیوں کا زمانہ

~~~~~~~~~~~~~~~~

محبّت رہ گئی بن کر مکمّل زندگی اپنی	مبارک بیخودی اپنی سلامت باخودی اپنی

زمانہ تھا کبھی اپنا یہ دنیا تھی کبھی اپنی	مگر اب تو نہ شامِ غم نہ صبحِ زندگی اپنی

نگاہیں چار ہوتے ہی طلسمِ ظاہری ٹوٹا	حقیقت نے حقیقت جان لی پہچان لی اپنی

~~~~~~~~~~~~~~~~

وہ کیا گئے بہارِ گلستاں لئے ہوئے	پھر پھول ہے جراحت پنہاں لئے ہوئے

دل بھی وہی ہے غم بھی وہی پھر یہ کیا کہ آج	ہر اشک ہے تبسّمِ پنہاں لئے ہوئے

~~~~~~~~~~~~~~~~

بہ شکل ناخدا جس میں ہیں ابتک جعفر و صادق وہ کشتی غرق ہو جائے تو بیڑا پار ہو جائے

تو ہلاکِ ہوش و تمکیں، میں شہیدِ کیف و مستی تری زندگی بھی مستی، مری زندگی بھی مستی

ڈگمگانے لگے ہیں پائے طلب دل ابھی ابتدائے راہ میں ہے

میرے پندارِ عشق پر مت جا یہ ادا ''ناز'' گاہ گاہ میں ہے

منظومات

تجدیدِ ملاقات

مدّت میں وہ پھر تازہ ملاقات کا عالم
خاموش اداؤں میں وہ جذبات کا عالم

نغموں میں سمویا ہوا وہ رات کا عالم
وہ عطر میں ڈوبے ہوئے لمحات کا عالم

اللہ رے وہ شدّتِ جذبات کا عالم
کچھ کہہ کے وہ بھولی ہوئی ہر بات کا عالم

چھایا ہوا وہ نشۂ صہبائے محبّت
جس طرح کسی رندِ خرابات کا عالم

وہ سادگیِ حسن، وہ محجوب نگاہی
وہ محشرِ صد شکر و شکایات کا عالم

نظروں سے وہ معصوم محبت کی تراوش
چہرے پہ وہ مشکوک خیالات کا عالم

عارض سے ڈھلکتے ہوئے شبنم کے دو قطرے
آنکھوں سے جھلکتا ہوا برسات کا عالم

بے شرطِ تکلّف وہ پذیرائیِ اُلفت
بے قیدِ تصنّع وہ مدارات کا عالم

ایک ایک نظر شعر و شباب و مئے و نغمہ ایک ایک ادا حُسنِ محاکات کا عالم

وہ نظروں ہی نظروں میں سوالات کی دنیا وہ آنکھوں ہی آنکھوں میں جوابات کا عالم

نازک سے ترنم میں اشارات کے دفتر ہلکے سے تبسّم میں کنایات کا عالم

پاکیزگیٔ عصمتِ جذبات کی دُنیا دوشیزگیٔ حُسنِ خیالات کا عالم

برہم وہ نظام دل و دُنیائے تمنّا پیہم وہ شکستوں میں فتوحات کا عالم

وہ عشق کی بربادیٔ زندہ کا مرقّع وہ حسن کی پایندہ کرامات کا عالم

وہ عارضِ پرنور، وہ کیفِ نگہِ شوق جیسے کہ دمِ صبح مناجات کا عالم

وہ جُرأتِ بیباک، وہ شوخی وہ شرارت وہ حسن و محبّت کی مساوات کا عالم

تھک جانے کے انداز میں وہ دعوتِ جُرأت کھو جانے کی صورت میں وہ جذبات کا عالم

شرمائی لجائی ہوئی وہ حُسن کی دُنیا وہ مہکی ہوئی بہکی ہوئی رات کا عالم

وہ بچھڑے دلوں کی وہ باہم صلح و صفائی پُرکیف وہ تجدیدِ ملاقات کا عالم

وہ عرش سے تا فرش برستے ہوئے انوار — وہ تہنیتِ ارض و سموات کا عالم

تا صبح وہ تصدیقِ محبّت کے نظّارے — تا شام وہ پھر فخر و مباہات کا عالم

عالم مری نظروں میں جگرؔ اور ہی کچھ ہے

عالم ہے اگرچہ وہی دن رات کا عالم!
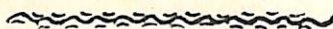
یاد

آئی جب اُن کی یاد تو آتی چلی گئی
ہر نقشِ ماسوا کو مٹاتی چلی گئی

ہر منظرِ جمال دکھاتی چلی گئی
جیسے انہیں کو سامنے لاتی چلی گئی

ہر واقعہ قریب تر آتا چلا گیا
ہر شے حسین تر نظر آتی چلی گئی

ویرانۂ حیات کے ایک ایک گوشہ میں
جوگن کوئی ستار بجاتی چلی گئی

دل پھُنک رہا تھا آتشِ ضبطِ فراق سے
دیپک کو میگھ ملار بناتی چلی گئی

بے حرف و بے حکایت و بے ساز و بے صدا
رگ رگ میں نغمہ بن کے سماتی چلی گئی

جتنا ہی کچھ سکون سا آتا چلا گیا
اتنا ہی بے قرار بناتی چلی گئی

کیفیتوں کو ہوش سا آتا چلا گیا
بے کیفیوں کو نیند سی آتی چلی گئی

کیا کیا نہ حُسن یار سے شکوے تھے عشق کو
کیا کیا نہ شرمسار بناتی چلی گئی

تفریقِ حسن و عشق کا جھگڑا نہیں رہا　　تمئیزِ قرب و بعد مٹاتی چلی گئی

میں تشنہ کامِ شوق تھا پیتا چلا گیا　　وہ مست انکھڑیوں سے پلاتی چلی گئی

اِک حسنِ بے جہت کی فضائے بسیط میں　　اُڑتی گئی، مجھے بھی اُڑاتی چلی گئی

پھر میں ہوں اور عشق کی بیتابیاں جگر

اچھا ہوا، وہ نیند کی ماتی چلی گئی

سراپا

وہ حُسنِ کافر، اللہ اکبر! | تخریبِ دوراں، آشوبِ محشر
وہ قدِ رعنا، وہ روئے رنگیں | عالم ہی عالم، منظر ہی منظر
گیسو و عارض، شانہ بہ شانہ | شامِ معطر، صبحِ منوّر
شرمائیں جن سے، ساون کی راتیں | وہ حلقہ ہائے زلفِ معنبر
مینا بدوشے، ساغر بہ چشمے | برلبط بدستے، مے خانہ در بر
وہ مست نظریں، جب اُٹھ گئی ہیں | ٹکرا گئے ہیں، ساغر سے ساغر
گفتارِ شیریں، رفتارِ نازک | خیّام و حافظ، تسنیم و کوثر
کشور کشائے دلہائے خوباں | فرماں روائے جانہائے مضطر
شہکارِ فطرت، اعجازِ قدرت | تعبیرِ خوابِ مانی و آذر

گفتار مبہم، اجمالِ ہستی | رفتارِ برہم، تفسیر محشر!
وہ بزمِ خلوت، وہ طرفِ گلشن | وہ دستِ سیمیں، وہ جامِ احمر
وہ حسنِ رقصاں، وہ جسمِ لرزاں | وہ عشقِ حیراں، وہ شوقِ مضطر
جانِ توجہ، رُوحِ تغافل | عریاں تبسم، پوشیدہ نشتر
وہ امتزاجِ شرم و شرارت | وہ احتیاطِ آداب پرور
وہ موسمِ گل، وہ شیشہ و مل | وہ کیف و مستی، وہ رُت، وہ منظر

نغمہ ہی نغمہ، خوشبو ہی خوشبو
صہبا ہی صہبا، ساغر ہی ساغر

(ناتمام)

قحطِ بنگال

بنگال کی میں شام و سحر دیکھ رہا ہوں
ہر چند کہ ہوں دور، مگر دیکھ رہا ہوں

افلاس کی ماری ہوئی مخلوق سرِ راہ
بے گور و کفن، خاک بہ سر دیکھ رہا ہوں

بچوں کا تڑپنا، وہ بلکنا، وہ سسکنا
ماں باپ کی مایوس نظر دیکھ رہا ہوں

بے مہری و بیدردی و افلاس و غلامی
ہے شامتِ اعمال، جدھر دیکھ رہا ہوں

انسان کے ہوتے ہوئے انسان کا یہ حشر
دیکھا نہیں جاتا ہے مگر دیکھ رہا ہوں

تعمیر کے پردے میں یہ اندازِ حکومت
تخریب بہ عنوانِ دگر دیکھ رہا ہوں

ہر چند کہ آثار تو کچھ اور ہیں لیکن
اک خیر بھی در پردۂ شر دیکھ رہا ہوں

بیداریِ احساس ہے ہر سمت نمایاں
بینائیِ اربابِ نظر دیکھ رہا ہوں

خاموش نگاہوں میں اُمنڈتے ہوئے جذبات
جذبات میں طوفانِ شرر دیکھ رہا ہوں

انجامِ ستم اب کوئی دیکھے کہ نہ دیکھے
میں صاف ان آنکھوں سے مگر دیکھ رہا ہوں

صیّاد نے لُوٹا تھا عنادل کا نشیمن
صیّاد کا لُٹتے ہوئے گھر دیکھ رہا ہوں

اربابِ وطن کو مری جانب سے ہو مژدہ
اغیار کو مجبورِ سفر دیکھ رہا ہوں

اک تیغ کی چشمک سی نظر آتی ہے مجکو
اک ہاتھ پسِ پردۂ در دیکھ رہا ہُوں

رحمت کا چمکنے کو ہے پھر نیّرِ تاباں
ہونے کو ہے اس شب کی سحر دیکھ رہا ہوں

بیداری و آزادی و اخلاص و محبّت
اک خلد درِ آغوشِ نظر دیکھ رہا ہوں

جو خواب کہ شرمندۂ تعبیر تھا اب تک
اُس خواب کی تعبیر جگرؔ دیکھ رہا ہُوں

پھرتے ہیں آستینوں میں خنجر لئے ہوئے

ہندوستان میں خیر سے ان کی کمی نہیں
لب پر ہیں جو خلوص کا دفتر لئے ہوئے

دیتے ہیں بات بات پر انسانیت کا درس
دل میں ہزار دشنہ و نشتر لئے ہوئے

چہرے جنونِ حبِ وطن سے دھوئیں دھوئیں
سینے خباثتوں کا سمندر لئے ہوئے

ظاہر میں اِک مجسمہ امن و آشتی
باطن میں لاکھ فتنہ محشر لئے ہوئے

کہتے ہیں بھائی بھائی ہیں اہلِ وطن تمام
پھرتے ہیں آستینوں میں خنجر لئے ہوئے

انسان جس میں بستے ہوں اس طرح کے جگر
بھاگ ایسی سرزمین سے بستر لئے ہوئے

(دورانِ قیام بمبئی ۱۹۴۶ء)

آج کل

فکرِ جمیل خوابِ پریشاں ہے آج کل — شاعر نہیں ہے وہ جو غزلخواں ہے آجکل

سازِ حیات، سازِ شکستہ ہے ان دنوں — بزمِ خیالِ جنّت ویراں ہے آج کل

آنکھیں تمام مشہدِ عشق و جمال ہیں — سینہ تمام گنجِ شہیداں ہے آج کل

انسانیت، کہ جس سے عبارت ہے زندگی — انساں کے سایے سے بھی گریزاں ہے آج کل

دل کی جراحتوں کے کھلے ہیں چمن چمن — اور اس کا نام فصلِ بہاراں ہے آج کل

صحنِ چمن میں بوئے وفا کا پتہ نہیں — رنگِ رُخِ بہار پُر افشاں ہے آج کل

تحصیلِ علم و کسبِ خطابت کے باوجود — تہذیبِ نفس سر بہ گریباں ہے آج کل

کیسا خلوص، کس کی محبّت، کہاں کا درد — خود زندگی متاعِ گریزاں ہے آج کل

افسانہ بن گئی ہیں وسیع الخیالیاں ‏ کم ظرفیِ مزاج نمایاں ہے آج کل

سازش، دغا، فریب، سخن پروری، دروغ ‏ ہر درد کا یہ نسخہ آساں ہے آج کل

اخلاق ایک فن ہے جو عصرِ جدید میں ‏ اندازِ حسن بن کے نمایاں ہے آج کل

شائستگی کے بھیس میں روحِ درندگی ‏ انساں کے لباس میں شیطاں ہے آج کل

وہ قومیت کہ جس سے ہے انسانیت ذلیل ‏ ہندوستاں میں کس قدر ارزاں ہے آج کل

دہلی و دہرہ دون، نواکھالی و بہار ‏ انساں ہے اور ماتمِ انساں ہے آج کل

ہے زخمِ کائنات، جو ہندو ہے ان دنوں ‏ ہے داغِ زندگی، جو مسلماں ہے آج کل

تعداد ایک فرقے کی جتنی بھی گھٹ سکے ‏ کارِ ثواب و کارِ نمایاں ہے آج کل

وہ دن گئے کہ طائر مقصود تھا شکار ‏ انسان کا شکار خود انساں ہے آج کل

کہتے ہیں جس کو صورتِ آزادیِ وطن ‏ دراصل ایک پیکرِ بے جاں ہے آج کل

کانٹے کسی کے حق میں کسی کو گل و ثمر ‏ کیا خوب اہتمامِ گلستاں ہے آج کل

سرمایہ داریوں کی طرفداریاں ہیں سب — لیکن مفادِ عام کا عنواں ہے آج کل

ہونے کو یوں تو روز نئی ہیں عنائتیں — اُردو زباں پہ خاص کر احساں ہے آج کل

نسبت اب اسکو شاہدِ مستور سے کہاں — شاعر ہے اور پیکرِ عریاں ہے آج کل

کچھ رہبرانِ قوم، جو مخلص ہیں واقعی — اُن کا چراغ بھی تہِ داماں ہے آج کل

لیکن میں دیکھتا ہوں کہ در پردۂ شہود — فطرت کا انتقام خراماں ہے آج کل

اس سے تو خودکشی ہی غنیمت ہے اے جگر
وہ مصلحت، جو پیشۂ مرداں ہے آج کل

گاندھی جی کی یاد میں!

وہی ہے شور ہائے و ہو، وہی ہجوم مرد و زن — مگر وہ حسنِ زندگی، مگر وہ جنتِ وطن

وہی زمیں وہی زماں، وہی مکیں وہی مکاں — مگر سرورِ یک دلی، مگر نشاطِ انجمن

وہی ہے شوقِ نو بہ نو، وہی جمالِ رنگ رنگ — مگر وہ عصمتِ نظر، طہارتِ لب و دہن

ترقیوں پہ گرچہ ہیں، تمدن و معاشرت — مگر وہ حسنِ سادگی، وہ سادگی کا بانکپن

شرابِ نو کی مستیاں، کہ الحفیظ والاماں — مگر وہ اک لطیف سا سرورِ بادۂ کہن

یہ نغمۂ حیات ہے کہ ہے اجل ترانہ سنج — یہ دورِ کائنات ہے کہ رقص میں ہے اہرمن

ہزار در ہزار ہیں اگرچہ رہبرانِ ملک — مگر وہ پیرِ نوجواں، وہ ایک مردِ صف شکن

وہی مہاتما وہی شہیدِ امن و آشتی — پریم جس کی زندگی، خلوص جس کا پیرہن

وہی ستارے ہیں، مگر کہاں وہ ماہتابِ ہند

وہی ہے انجمن، مگر کہاں وہ صدرِ انجمن

آوازیں

اگرچہ صدیاں گذر چکی ہیں، مگر زہے کاروبارِ فطرت

وہی خزاں کا ہے رقصِ عریاں، وہی ہے جشنِ بہار اب بھی

چمن کے مالی اگر بنالیں موافق اپنا شعار اب بھی

چمن میں آسکتی ہے پلٹ کر، چمن سے روٹھی بہار اب بھی

نسیم ہے آج بھی طرب زا، درخت ہیں سایہ دار اب بھی

مگر وہ انساں کہ جس کے چھونے سے جلتے ہیں برگ و بار اب بھی

انہیں خبر کیا نہیں ہے اسکی انہیں میں ہیں فتنہ کار اب بھی

مگر وہ ہیں وقت و مصلحت کے قدیم و تازہ شکار اب بھی

مصیبتوں کو پیامِ عشرت، کہ عقل ہے کجروی کی جانب
صعوبتوں کو نویدِ راحت، جنوں ہے آہستہ کار اب بھی

اگرچہ آزادیِ وطن کو گذر چکا ایک سال کامل!
مگر خود اہلِ وطن کے ہاتھوں فضا ہے ناسازگار اب بھی

خود اپنی بدنیتّی کے ہاتھوں بُرے نتائج بھگت رہے ہیں!
صداقتوں سے حقیقتوں سے وہی ہے لیکن فرار اب بھی

زمین بدلی، زمانہ بدلا، مگر نہ بدلے تو وہ نہ بدلے
جو تنگ و تاریک ذہنیت تھی، وہی ہے بر روئے کار اب بھی

یہ زندگی غیر مطمئن سی، شکوک و شبہات کی یہ دُنیا
مگر وہ فرمائے جا رہے ہیں کہ رشتہ ہے استوار اب بھی

کوئی یہ چپکے سے ان سے پُوچھے کہاں گئے آپکے وہ دعوے
نچوڑتا ہے لہو غریبوں کا دستِ سرمایہ دار اب بھی

سفارشیں ظالموں کے حق میں پیامِ رحمت بنی ہوئی ہیں

نہیں ہے شائستہ سماعت دُکھے دلوں کی پکار اب بھی

اسی کا ہے نام اگر ترقی تو اس ترقی سے باز آئے

کہ خونِ مخلوق سے خدا کی زمین ہے لالہ زار اب بھی

ہمیں ملا کر بھی خاک و خوں میں نہیں ہیں وہ مطمئن ابھی تک

ہماری خاکِ لحد کے ذرّے ہیں اُن کے دامن پہ بار اب بھی

جو محوِ جشنِ نظام تو ہیں پکار کر اُن سے کہہ رہا ہوں

یہ جان ہے سوگوار اب تک یہ دل ہے ماتم گسار اب بھی

منافقت کی ہزار باتیں وہ سنتے رہتے ہیں اور خوش ہیں

مگر صداقت کی صاف و سادہ سی بات ہے ناگوار اب بھی

نہ وہ مروت، نہ وہ صداقت، نہ وہ محبّت، نہ وہ شرافت

رہینِ خوف و خطر ہیں یعنی، سکون و امن و قرار اب بھی

زبان و دل میں نہ ربطِ صادق، نہ باہمی وہ خلوصِ کامل

جو تھے غلامانہ زندگی میں، وہی ہیں لیل و نہار اب بھی

غلط یہ جمہوریت کے دعوے، دروغ یہ زندگی کے نقشے

دلیل اس کی یہی ہے کافی کہ ذہن ہے تنگ و تار اب بھی

یہ جشنِ آزادیِ وطن ہے، مگر اسی جشن و سرخوشی میں

بہت ہیں سینہ فگار اب بھی، بہت ہیں بیروزگار اب بھی

یہی جو سادہ سے قہقہے ہیں، یہی جو پھیکے سے ہیں تبسّم

انہی کی تہہ میں بہت سے اشکوں کے ہیں رواں آبشار اب بھی

گرانیاں اُس طرف وہ ارزاں، ادھر یہ افلاس و تنگدستی

مگر حکومت کا ہے یہ عالم، ذرا نہیں شرمسار اب بھی

ہزارہا انقلاب دیکھے، ہزارہا تجربوں سے گذرے

خرد میں تنگی، عمل میں لغزش، جنوں ہے ناپختہ کار اب بھی

یہ رشوتوں کی، یہ سازشوں کی، یہ نفع اندوزیوں کی لعنت

وہ خود ہی انصاف سے یہ کہدیں نہیں وہ کچھ ذمہ دار اب بھی

اُنہیں کے حلقوں سے خود اُنہیں کی مخالفت عام ہو رہی ہے

ہماری جانب سے لیکن ان کی نظر ہے بیگانہ وار اب بھی

کہاں کی دلداری و محبت، تلافیوں کا تو ذکر ہی کیا؟

حقوق پامال کر رہے ہیں، حقوق کے پہرہ دار اب بھی

کبھی ہوئی ہے نہ ہو سکے گی، مسرّت آزادیوں کی حاصل

کہ عام انسانیت کا عالم ہے تشنہ و بے قرار اب بھی

وسیع مسلک، رفیع فطرت، خلوص ایماں، خلوص نیّت

انہیں فضائل پہ ہے وطن کے وقار کا انحصار اب بھی

زمانہ کیا کیا نہ کہہ چکا ہے، زمانہ کیا کیا نہ کہہ رہا ہے

مگر وہ ہیں وضعدار ایسے ذرا نہیں شرمسار اب بھی

خلوصِ نیّت سے صرف اپنی ہی زندگی پر کریں توجّہ

خلوصِ نیت کی منتظر ہے سعادتِ کردگار اب بھی

کبھی کبھی غور کرتے رہیئے، جگر کا مصرع یہ پڑھتے رہیئے

چمن میں آ سکتی ہے پلٹ کر چمن کی روٹھی بہار اب بھی

جگر کی ہے زندگی محبّت، نہیں ہے اس کو کسی سے نفرت

جگر کے دل میں ہے سب کی عزّت جگر ہے یاروں کا یار اب بھی
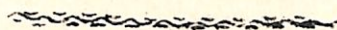
گذر جا!

بازیچۂ اربابِ سیاست سے گذر جا
اس کارگہۂ مکر و ضلالت سے گذر جا

ہر عشرتِ بے وقت و محنت سے گذر جا
جنت بھی میسّر ہو تو جنت سے گذر جا

جرأت ہے، تو ہر بیم صداقت سے گذر جا
ہمّت ہے، تو محدود محبت سے گذر جا

ہر تنگ نظر اہلِ صحافت سے گذر جا
ہر سادہ و پرکار عبارت سے گذر جا

الفاظ نہیں دام ہیں یہ مکر و دغا کے
زورِ قلم و جوشِ خطابت سے گذر جا

خودداریِ بیباک شرافت کا ہے جوہر
اظہارِ وفا، جوشِ عقیدت سے گذر جا

تا چند یہ توہینِ حقوقِ رعیّت!
اُٹھ اور اب اس قعرِ ذلّت سے گذر جا

سر تا بقدم پیکرِ ایثار و عمل بن
ہر مرحلۂ شکر و شکایت سے گذر جا

کرنا ہے اگر کار نمایاں کوئی تجھ کو
اٹھ، اور ہر آسانیِ لذّت سے گذر جا

قسمت تری خود ہے ترے کردار میں مضمر
قسمت کو بنانا ہے تو قسمت سے گذر جا

جینا ہے جو منظور، تو جینے کی نہ کر فکر
راحت کی تمنّا ہے تو راحت سے گذر جا

جو صبر و قناعت تجھے مفلوج بنا دے
بہتر ہے کہ اُس صبر و قناعت سے گذر جا

پیدا نہ کرے تجھ میں جو پاکیزگیِ رُوح
اُس فلسفہ و دانش و حکمت سے گذر جا

نادار کی مجبُوری و پستی کی طرف دیکھ
ہر قصرِ فلک بوس کی رفعت سے گذر جا!

جھُلسے ہوئے اجسام، سسکتی ہوئی رُوحیں
کچھ سوچ کے اس منظرِ عبرت سے گذر جا

ہر لمحہ یہاں جہدِ مسلسل کا ہے پیغام
اے تنگِ طلب! وقفۂ راحت سے گذر جا

دنیا، کہ ہے اک رزمگہۂ شیطنت و حق
لڑتا ہوا ہر کفر و ضلالت سے گذر جا

سیدھی سی بس اک راہِ صداقت پہ چلا چل
پُر پیچ گذرگاہِ سیاست سے گذر جا

انسانیتِ عام کے مرکز کی بنا ڈال
ہر ناقص و محدود جماعت سے گذر جا

اوروں کے لئے چھوڑ یہ تاریک مقامات
نفرت سے عداوت سے شقاوت سے گذر جا

لیتا ہوا اک درس حیاتِ ابدی کا
ہر تازہ غم و رنج و مصیبت سے گذر جا

حق پر ہے اگر تو تو شہادت کا مزا چکھ
بچ کر نہ اس آشوبِ ہلاکت سے گذر جا

ہے خدمتِ مخلوق ہی نعم البدل اپنا
کر خدمتِ مخلوق، تجارت سے گذر جا

ملّت کی بقا ہے تری اس موت میں پنہاں
سر دے کے تو میدانِ شہادت سے گذر جا

سرمایہ و سازش کے یہ مردود عزائم
تو صرف اک اندازِ حقارت سے گذر جا

توحید کی طاقت کو بنا اپنا معاون
ہر واہمۂ قلت و کثرت سے گذر جا

حائل ہو قیامت بھی اگر راہ میں تیری
ٹھکرا کے قیامت کو، قیامت سے گذر جا

بیباک گذر رزم گہۂ دہر سے لیکن
مقصد یہ نہیں فہم و فراست سے گذر جا

تو حُسن کے اک دائرۂ کُل کی طرف آ
ہر جزوی و محدود حقیقت سے گذر جا

کونین تری وسعتِ رفعت میں ہے خود محو
کونین کی ہر وسعت و رفعت سے گذر جا

تجھ پر جو گروہِ جہلا طنز کرے کچھ
با رعب و دلآویز متانت سے گذر جا

ہوتی ہے یونہی نشو و نما فکر و عمل کی — ہنستا ہوا ہر جبرِ حکومت سے گذر جا

انسان بن انسان، یہی ہے تری معراج — رنگ و وطن و قوم کی لعنت سے گذر جا

تیرے یہ پیامات جگر ہم کو مبارک !

تو بھی اب اس پستیٔ عزلت سے گذر جا !

نوائے وقت

اُٹھو اُٹھو! کہ زندگی ہی زندگی پہ بار ہے

بڑھو! بڑھو! کہ چار سُو پکار ہی پُکار ہے

وہ وقت ہے کہ علمِ حق ہے علمِ شیطنت میں گم

وہ وقت ہے کہ آدمی کا آدمی شکار ہے

کہاں کے مطربِ غزل! کہاں کے شاہد و چمن

کہ زندگی تمام تر بلحاظِ کارزار ہے

غضب کہ چھائی جا رہی ہیں ظلمتوں کی بدلیاں

ستم کہ زد میں آندھیوں کی شمعِ روزگار ہے

زمیں کو روندتے ہوئے، صفوں کو چیرتے ہوئے

بڑھے چلو بڑھے چلو! یہ وقت کی پکار ہے

زمانے کا آقا غلامِ زمانہ

کدھر ہے تو اے جرأتِ باغیانہ
بدل دے مقدر، پلٹ دے زمانہ

کھلا بابِ زنداں تو کیا اس سے حاصل
کہ خود زندگی بن گئی قید خانہ

محبت اُڑی جا رہی ہے دِلوں سے
حقیقت بنی جا رہی ہے فسانہ

شرافت کا معیار، افراطِ دولت
صداقت کی معراج، لفظی ترانہ

زبانوں پہ اصلاحِ قومی کے نعرے
مگر طینتیں بیشتر مفسدانہ

غریبوں پہ جو کچھ گذرتی ہے گذرے
سمٹ آئے جیبوں میں لیکن خزانہ

مجسّم خود اک پیکرِ مادّیت
مگر درسِ روحانیت عارفانہ

دلائل کی ہنگامہ آرائیوں میں
کہیں رُوح بسمل، کہیں دل نشانہ

نتائج سے بھی آنکھ کھُلتی نہیں ہے
ہر اقدام اب تک ہے نامنصفانہ

بشر کی یہ پستی، ارے توبہ توبہ!
زمانے کا آقا، غلامِ زمانہ!

دل حسیں ہے تو محبّت بھی حسیں پیدا کر

پہلے تو حُسنِ عمل، حُسنِ یقیں پیدا کر — پھر اسی خاک سے فردوسِ بریں پیدا کر

یہی دُنیا کہ جو بُت خانہ بنی جاتی ہے — اسی بُت خانے سے کعبے کی زمیں پیدا کر

رُوحِ آدم نگراں کب سے ہے تیری جانب — اُٹھ اور اک جنتِ جاوید یہیں پیدا کر

خس و خاشاکِ توہّم کو جلا کر رکھ دے — یعنی آتش کدۂ سوزِ یقیں پیدا کر

غم میسّر ہے تو اس کو غمِ کونین بنا — دل حسیں ہے تو محبّت بھی حسیں پیدا کر

آسماں مرکزِ تخئیل و تصوّر کب تک — آسماں جس سے خجل ہو وہ زمیں پیدا کر

دل کے ہر قطرہ میں طوفانِ تجلّی بھر دے — بطنِ ہر ذرّہ سے اک مہرِ مبیں پیدا کر

بندگی یوں تو ہے انسان کی فطرت لیکن — ناز جس پہ کریں سجدے وہ جبیں پیدا کر

پستئ خاک پہ کب تک تری بے بال و پری — پھر مقام اپنا سرِ عرشِ بریں پیدا کر

عشق ہی زندہ و پایندہ حقیقت ہے جگر

عشق کو عام بنا ذوقِ یقیں پیدا کر

اعلانِ جمہوریت

(۲۶ر جنوری ۱۹۵۰ء)

خدا کرے کہ یہ دستور سازگار آئے   جو بے قرار ہیں اب تک انہیں قرار آئے

بہار آئے اور اس شان کی بہار آئے   کہ پھول ہی نہیں کانٹوں پہ بھی نکھار آئے

وہ سرخوشی ہو کہ خود سرخوشی بھی رقص کرے   وہ زندگی ہو کہ خود زندگی کو پیار آئے

کھلے جو پھول تو دے جسمِ ناز کی خوشبو   کلی اگر کوئی چٹکے، صدائے یار آئے

چمن چمن ہی نہیں جس کے گوشے گوشے میں   کہیں بہار نہ آئے، کہیں بہار آئے

یہ میکدے کی، یہ ساقی گری کی ہے توہین   کوئی ہو جام بکف، کوئی شرمسار آئے

خلوص و ہمتِ اہلِ چمن پہ ہے موقوف   کہ شاخِ خشک میں بھی پھر سے برگ و بار آئے

جنونِ عشق ہو صالح اگر، تو ممکن ہے   کہ پھر اس اجڑے گلستاں میں بھی بہار آئے

مذاقِ عشق بدل دے مزاجِ کون و فساد   دلوں تک آئے جو غم بھی، تو خوشگوار آئے

نظامِ خلق و مروت کبھی جو برہم ہو — نگاہِ لطف و محبت بڑھے، سنوار آئے

دلوں پہ نقش نہ رہ جائے کوئی نفرت کا — یہ فتنہ بن کے نہ آشوبِ روزگار آئے

برائی کرنے سے پہلے ہی کاش انساں کو — نظر ہر ایک بدی کا مآلِ کار آئے

وہ حادثات زمانے سے محو ہو جائیں — کہ جن کے ذکر سے انسانیت کو عار آئے

نمائشی ہی نہ ہو، یہ نظامِ جمہوری — حقیقتاً بھی زمانے کو سازگار آئے

خلوص و عدل و مساوات دل میں گھر کر لیں — نہ یہ کہ ذکر زباں پر ہی بار بار آئے

ضمیر صاف ہو اپنا تو غیر ممکن ہے — کسی کے آئینۂ قلب پر غبار آئے

محبت آج بھی مشعل فروزِ منزل ہے — اگر نہ کور نگاہی بروئے کار آئے

دلوں کی کھوٹ ہو جس کے ضمیر میں شامل — نہ آئی ہے وہ سیاست نہ سازگار آئے

زبان و دل میں بہم ارتباط ہو ایسا — کہ جو زباں کہے، دل کو اعتبار آئے

بنا دیا ہے محبت نے آگ کو گلزار — مگر جو آج کے انساں کو اعتبار آئے

نہ ہو جو عام مسرت، محال ہے اے دوست!
کہ زندگی کو کسی حال میں قرار آئے

ساقی سے خطاب

"ساقی" اور "رند" دونوں میخانۂ روحانیت سے وابستہ ہیں۔ دونوں میں شدید محبت ہے
جہاں ساقی عظیم المرتبت ہے وہاں رند بھی معمولی رند نہیں بلکہ ایک خاص مرتبہ رکھتا ہے۔
عصر جدید کے حالات سے متاثر ہو کر رند میخانہ کی زندگی ترک کرنا اور جدوجہد کی دنیا میں
قدم رکھنا چاہتا ہے اور ساقی سے اجازت کا طالب ہوتا ہے۔
ساقی کو خیال ہوتا ہے کہ عملی دنیا میں خدا جانے رند سے کیا کیا لغزشیں ہوں لیکن رند پر
ساقی کا احساس منکشف ہو جاتا ہے۔ اور وہ یہ کہہ کر ساقی کو مطمئن کرنا چاہتا ہے ؎

سرِ مقتل بھی دیکھیں گے چمن اندر چمن ساقی — نہ لاؤ وسواس دل میں جو ہیں تیرے دیکھنے والے

اسی کے ساتھ نظم میں "معیارِ جنوں"، "تنظیمِ میخانہ"، "انسان" اور "انسانیت"، "وطن" اور "وطنیت" وغیرہ
وغیرہ کے متعلق بھی رند یعنی شاعر کے نظریات کی وضاحت ہو جاتی ہے۔

کہاں سے بڑھ کے پہونچے ہیں کہاں تک علم و فن ساقی
گر آسودہ انساں کا نہ تن ساقی نہ من ساقی
یہ سنتا ہوں کہ پیاسی ہے بہت خاکِ وطن ساقی
خدا حافظ چلا میں باندھ کر سر سے کفن ساقی

سلامت تو، ترا میخانہ، تیری انجمن ساقی
مجھے کرنی ہے اب کچھ خدمتِ دار و رسن ساقی

رگ و پے میں کبھی صہبا ہی صہبا رقص کرتی تھی
مگر اب زندگی ہی زندگی ہے موج زن ساقی

کبھی میں بھی تھا شاہد در بغل، توبہ شکن مے کش
مگر بننا ہے اب خنجر بکف، ساغر شکن ساقی

نہ لا وسواس دل میں، جو ہیں تیرے دیکھنے والے
سرِ مقتل بھی دیکھیں گے چمن اندر چمن ساقی

جو دشمن کے لئے بھی سر سے اپنے کھیل جاتے ہیں
دلِ خوباں میں کھپتا ہے انہیں کا بانکپن ساقی

ترے جوشِ رقابت کا تقاضا کچھ بھی ہو، لیکن
مجھے لازم نہیں ہے ترکِ منصب و فعتہً ساقی

ابھی ناقص ہے معیارِ جنوں، تنظیم میخانہ
ابھی نامعتبر ہے تیرے مستوں کا چلن ساقی

وہی انساں، جسے سرتاجِ مخلوقات ہونا تھا
وہی اب سی رہا ہے اپنی عظمت کا کفن ساقی

لباسِ حریت کے اُڑ رہے ہیں ہر طرف پُرزے
بساطِ آدمیّت ہے شکن اندر شکن ساقی

مجھے ڈر ہے کہ اس ناپاک تر دورِ سیاسی ہیں
بگڑ جائے نہ خود میرا مذاقِ شعر و فن ساقی

کہیں مُلحد نہ بن جائیں مرے افکارِ سنجیدہ
کہیں مُرتد نہ ہو جائے مرا ذوقِ سخن ساقی

کہیں خود حُسن رہ جائے نہ قومی ملکیّت بن کر
کہیں خود عشق ہو جائے نہ محدودِ وطن ساقی

کہاں ہیں رندِ سرگشتہ، کہاں یہ دعوئے تمکیں
سمجھ لے اس کو بھی میرا اک اندازِ سخن ساقی

عجب کیا ہے یہ بہکی بہکی باتیں رنگ لے آئیں
بہت باہوش رہتا ہے مرا دیوانہ پن ساقی

نمودِ صبحِ کاذب ہی دلیلِ صبحِ صادق ہے
اُفق سے زندگی کی دیکھ وہ اُبھری کرن ساقی

بدہ جامِ مئے باقی کہ در جنت نخواہی یافت
سوادِ ساحلِ گنگا و گلگشتِ چمن ساقی

قندِ پارسی

(۱)

به سرِ تو ساقیِ مستِ من، به سرورِ بے طلبی خوشم

اگرم شراب نمی دہی، به خمارِ تشنه لبی خوشم

چه خوش است ذوقِ محبتم! چه بلاست لذّتِ فرقتم

که به یادِ زلفِ سیاهِ تو، به ہجومِ تیره شبی خوشم

چه مقامِ عشق و چه منزلے که دریں زماں منِ بیدلے

نه به شاہدے، نه به مطربے، نه به حاصلِ عنبی خوشم

زنگاهِ عشوه طرازِ تو، چه گذشت بر دلِ من که من

نه به نالهٔ سحری خوشم نه به آهِ نیم شبی خوشم

زجفائے حسنِ تمامِ تو نه حکایتے نه شکایتے

چه حکایتے چه شکایتے که بترکِ بے ادبی خوشم

(۲)

ہمہ ہوشِ عشقم، ہمہ سوزِ جانم

حذر اے جواناں! کہ پیرِ جوانم

نہ اسمم نہ جسمم نہ اینم نہ آنم

چہ رازے عیانم! چہ سرِ نہانم

جہاں از من و من زجانِ محبّت

بجانِ محبّت! کہ جانِ جہانم

خوشا نسبتِ عشق لافانی تو

فنا گشتم و زندہ جاودانم!!

مطبوعہ فیروز پرنٹنگ ورکس لاہور میں عبدالحمید خان پرنٹر کے اہتمام سے طبع ہوا